نگار

نیاز فتحپوری

قواعد رسالہ نگار

۱ - رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے
۲ - رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا
۳ - خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جنپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہین
۴ - جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے
۵ - مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئین -
۶ - سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ -

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۲ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دین گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے — جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

مرزا غالب
اردوے معلی ۱۲ر
عود ہندی عہ
دیوان جیبی ۸ر
مکمل دیوان عہ

مولانا نذیر احمد
حمائل مترجم ۱۲ر
تحقیق و الفرائض ۸ر

بنات النعش ۹ر
مراۃ العروس ۱۰ر
توبۃ النصوح ۱۲ر
موعظہ حسنہ ۱۲ر
رویائے صادقہ ۱۲ر
ایامیٰ ۱۲ر
فسانہ مبتلا ۱۲ر
ابن الوقت ۱۲ر
مصائب غدر ۱۲ر

مولانا شبلی
سیرۃ النبی جلد اول ۱۲ر
〃 دوم ۱۲ر
〃 سوم عہ
الفاروق عاَر
سیرۃ النعمان ۱۲ر
الغزالی ۱۲ر
المامون ۱۲ر
سوانح مولانا روم عاَر
سفرنامہ مصر و شام عاَر
علم الکلام عاَر
الکلام عاَر
رسائل شبلی ۱۲ر
مقالات شبلی عہ
شعر العجم جلد اول ۸ر
〃 دوم عاَر
〃 سوم عاَر
〃 چہارم ۸ر
〃 پنجم عاَر
موازنہ انیس و دبیر ۸ر
مضامین عالمگیر ۸ر
آغاز اسلام ۸ر
کلیات فارسی عاَر
کلام شبلی اردو ۸ر

امیر مینائی
امیر اللغات عہ
صنمخانہ عشق عاَر
مراۃ الغیب ۱۲ر

محامد خاتم النبیین ۸ر
ضیائے سخن عہ
مکاتیب امیر مینائی عاَر

رتن ناتھ سرشار
فسانہ آزاد عہ
سیر کہسار ۸ر
خدائی فوجدار عاَر
جام سرشار عاَر
الف لیلی بطرز ناول عہ

جلد ۱۳ شمارہ ۶ رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول معہ

فہرست مضامین جون سنہ ۱۹۲۸ء

ملاحظات	نیاز	۲
تذکرۂ آبجیات	"آرگس"	۵
ایک فلسفی کا انجام (افسانہ)	نیاز	۱۸
دیوان یقین	سید محی الدین قادری زور ایم اے	۲۲
بیگار (افسانہ)	اعظم کریوی	۲۸
نقد الشعر	کیفی چریاکوٹی	۳۷
ڈرامے کا ایک سین	احسن لکھنوی	۴۱
فلسفۂ مذہب	سید مقبول احمد بی اے	۴۷
چنگاری (افسانہ)	نیاز	۵۴
لارڈ رپن کا عہد حکومت	ض ۔ ا ۔ ب ۔ بی اے	۶۱
روپیہ کی شرح مبادلہ	ابو المنصور حمید	۶۸
شکست تمنا (نظم)	حافظ غازیپوری	۷۲
اعجاز (نظم)	محمود اسرائیلی	۷۵
پرستش خیال (نظم)	روش صدیقی	۷۶
حیا (نظم)	نظیر لودھیانوی	۷۷
اسباب مخاصمت (نظم)	امین حزیں	۷۸
غزلیات:-	اثر رامپوری، جگر بریلوی	۷۹
"	ذوقی، راز رامپوری	
"	کیفی چریاکوٹی	۸۰
ڈائری کا ایک ورق	نیاز	۸۱
باب الاستفسار	نیاز	۸۴
معلومات	نیاز	۹۲
نمائندہ نگار کی ڈائری	"تبسم"	۹۵-۹۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۳　　جون سنہ ۱۹۲۸ء　　شمار ۶

ملاحظات

اس رسالہ کے ساتھ تیرہویں جلد نگار کی ختم ہوتی ہے ہرچند رسائل کے باب میں آغاز و انجام کوئی اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ کسی جلد کا ختم ہونا کسی منزل تک پہونچنا تو ہے نہیں کہ ٹھہر کر ذرا دم لے لیا جائے، لیکن بعض حضرات چونکہ درمیان سے رسالہ کا مطالعہ پسند نہیں کرتے اس لئے اُن کی اطلاع کے لئے یہ لکھنا ضروری تھا۔

نگار کی گزشتہ جلد میں تنقیدی مضامین زیادہ شائع ہوے اور چونکہ تنقید ہمیشہ تعلقات کو ناخوشگوار بنا دیتی ہے، اسلئے حیرت کی بات نہیں اگر بعض لوگوں کو شکایتیں پیدا ہوگئی ہوں۔ لیکن اس کا تکلیف دہ منظر اگر کوئی ہو سکتاہے تو یہ کہ نگار کی اس روش کو فرقہ دارانہ سمجھکر مجھپر یہ الزام قائم کیا گیا کہ میں شیعہ شعراء و مصنفین کی تنقیص کے لئے ایک خاص پروپگنڈا کر رہا ہوں اور ایک مخفی جماعت اس مقصود کے لئے ترتیب دے رہا ہوں۔ اتنے بڑے الزام کے ثبوت میں ایک مضمون تو وہ پیش کیا جاتاہے جو غالب کے متعلق شائع ہوچکاہے اور دوسرا آبحیات کی تنقید کا اور ممکن ہے اسی سلسلہ میں میرے اس نوٹ کو بھی شامل کر لیا جائے جو علی عباس حسینی کے ایک فسانہ پر شائع ہوا تھا۔ اور اگر اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے کہ "دشمن کا دوست دشمن ہوتا ہے"، تو نگار کے مومن نمبر کو بھی فہرست دلائل میں شامل کر لیجئے، الغرض تمام وضعی و غیر وضعی دلایل جو میری عصبیت کے ثبوت میں

پیش کئے جاسکتے ہیں۔ یہ اور اس قدر ہیں۔ میں اس کو بھی تنگ نظری سمجھتا ہوں کہ اس نوع کی تنگ نظریوں کی طرف توجہ کروں، لیکن چونکہ میرے حلقۂ احباب میں شیعہ حضرات کی بھی کافی جماعت ہے، اور ان میں سے میں بعض کے خلوص ومحبت کے لئے میں نہایت حریص ہوں، اس لئے اس قدر اظہار ضروری خیال کیا گیا۔

بہرحال مجھے اپنی صفائی میں زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو شخص مذہب کے باب میں اس قدر آزاد ہو کہ اعتقادات میں محض توحید اور عبادات میں صرف تصفیۂ اخلاق کو اسلام کے لئے ضروری خیال کرتا ہو اور جو مسلک ومذہب کی تفریق کو پوری طرح سمجھتا ہو، اسپر یہ الزام قائم کرنا کہ وہ تشیع وتسنن کے فرق کو پیش نظر رکھکر ادبی تنقید کرتا ہے، اتنا بڑا گناہ ہے کہ «لا یقاس بہ ذنب»

بہرحال جو بات میرے نزدیک حق ہے اس کا اعلان ہمیشہ کرونگا، خواہ اس کے جواب دینے میں کوئی شخص کتنی ہی سخت غلطی میں کیوں نہ مبتلا ہو جائے۔

تذکرۂ آبحیات پر تنقیدی مضمون اس مہینے میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کی کامیابی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی نصف ہی مضمون شایع ہوا تھا کہ لوگوں میں بے چینی پیدا ہو گئی ——— اور سب وشتم کا نام جواب رکھ کر ایک مختص الجماعت پرچہ میں اُسے شائع کر دیا گیا۔ چونکہ جواب میں اصل اعتراضات سے اعراض کر کے صرف آبحیات کے انشا کی تعریف میں زور قلم صرف کیا گیا ہے اس لئے لازم آیا کہ اب منشی محمد حسین آزاد کے معجزات ادب پر بھی روشنی ڈالی جائے اور بتایا جائے کہ آزاد کے جن مخصوص کارناموں کو وہ اس قدر "چمکتا ہوا" بتاتے ہیں، حقیقتاً "سونا" وہ بھی نہیں ہیں۔ آئندہ اشاعت کا انتظار کیا کیا جائے۔

ایک فلسفی کا انجام والٹیر، فرانس کے مشہور فسانہ نگار کے ایک فسانہ کا ترجمہ ہے جو عربی سے لیا گیا ہے
دیوان یقین پر جناب سید محی الدین قادری زور کا مقالہ قیمتی چیز ہے۔ جناب اعظم کریوی نے اپنے فسانہ نگار میں اپنے مخصوص مدعا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ نقد الشعر سلسلہ کا مضمون ہے اور از بس کار آمد۔ ڈرامے کا ایک سین جناب احسن لکھنوی کا عطیہ ہے جو فن ڈرامہ نگاری میں خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ فلسفۂ مذہب کا سلسلہ جاری ہے اور ابھی رہیگا۔ لارڈ رپن کا عہد حکومت اس نمبر میں ختم ہو گیا۔ مسٹر بلنٹ کی جس کتاب کا یہ ترجمہ ہے وہ سیاسی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتی ہے اور ہر چند اس کا ترجمہ اب اتنے زمانہ کے بعد شائع ہونا کوئی برمحل امر تو نہیں ہے، لیکن کبھی نہ ہونے سے دیر میں ہو جانا ہی "غنیمت ہے"۔ روپیہ کی شرح مبادلہ پر ابو المنصور حمید کا مضمون مختصر ہے لیکن عام پبلک کے لئے ابھی ایسے ہی مبادیاتی مضامین کی ضرورت ہے۔ ڈائری کا ایک ورق ایک اور دلچسپ افسانہ کا آغاز کرتا ہے جو غالباً ماہ آئندہ میں ختم ہو گا۔ باب الاستفسار میں ایک ایسے مسئلہ کا آغاز ہوا ہے جو غالباً کئی ماہ تک جاری رہیگا۔

منظومات میں جناب حافظ غازیپوری کی نظم بہت کچھ کیفیات کی حامل ہے، کاش اس میں عاشقانہ عجز و نیاز کی سادگی بھی ہوتی رو ش صدیقی کی نظم پرستش خیال بھی ولولۂ شباب کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے لیکن اسمیں تخلیقی رنگ کی کمی ہو

امین حزین کی نظم جو اسباب مخاصمت کی غیر شاعرانہ عنوان سے شائع ہوئی ہے، خوب ہے۔ اور ان کے پیغام شاعری کو بہت نمایاں طور پر ظاہر کر رہی ہے۔ نظیر لودہیانوی کے "حسیات" اس رنگ سے جدا نہیں ہیں جو اُن کی طبیعت کی خصوصیت ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ کچھ دن سے ان کے اشعار میں "تاثرات عشق" زیادہ پائے جانے لگے ہیں اور بجائے اس کے کہ وہ دوسروں کو کوئی درس دیں خود اپنی جراحت کا اعلان زیادہ کرتے ہیں۔

غزلوں کے بھی بعض بعض شعر بہت اچھے ہیں۔

تذکرۂ ظرفا کے متعلق جو اعلان منیجر کی طرف سے شائع ہو رہا ہے اس کے متعلق ممکن ہو کہ بعض حضرات کو غلط فہمی پیدا ہو جائے اس لئے میں ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ تذکرہ مکمل ہو چکا ہے، کتابت شروع ہو گئی ہے اور جلد سے جلد اس کو شائع کر دیا جائے گا لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جلد سے جلد کے معنی بھی لیتھو پریس کی دنیا میں مہینوں ہوا کرتے ہیں، اس لئے جو حضرات پیشگی روپیہ روانہ کریں وہ یہ سمجھکر بھیجیں کہ ابھی کئی مہینے تک اُن کو تذکرہ کا انتظار کرنا پڑیگا۔ بہر حال اگر وہ چند ماہ کا انتظار کر سکتے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ اسوقت دو روپیہ بھیجدینے سے اُن کو ایسی کتاب ملیگی جو بعد تکمیل کسیطرح چار، پانچ روپیہ سے کم میں فروخت نہ ہوگی۔

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں مدیر سچ (جناب عبد الماجد صاحب دریابادی) کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا اسپر آخر کار اخبار سچ مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۲۸ء میں پ ۲ کالم کا ایک نوٹ شائع ہو ہی گیا ہر چند کہ اُدھر جناب عبد الماجد صاحب "رسالہ نگار کی زیارت سے علی العموم محروم رہتے ہیں" اور ادہر میں "اخبار سچ کی زیارت سے علی الخصوص محروم رہتا ہوں" لیکن پھر بھی رسالہ نگار کو انھوں نے اور سچ کو میں نے دیکھا اور اس طرح بحمد اللہ آخر کار "کفر و اسلام" کا تصادم ہو ہی گیا۔

حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

فاضل مدیر نے جس لطف کے ساتھ میرے کفر و الحاد، میری ضلالت و گمراہی کا ذکر فرمایا ہے، اس کی داد اس دنیا میں تو انہیں مل نہیں سکتی اور عاقبت کی خبر خدا جانے صاحب موصوف نے کنایتہً اس سے بھی انکار کیا ہو کہ وہ خواجہ حسن نظامی کے مضمون فرام قبلہ ٹو شملہ سے متاثر ہوئے ممکن ہو کہ یہ صحیح ہو کیونکہ میں نے بھی محض سماعت کی بنا پر لکھا تھا۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی تو بظاہر کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ فلسفی شاہ کا لقب بھی بہر حال ان کو اسی دربار سے ملا تھا جسے خاموشی سے قبول کر لیا گیا۔

نیاز

تذکرہ آبحیات پر ایک ناقدانہ نظر

(بسلسلۂ نگار ماہ مئی ۱۹۲۸ء)

میر سوز

آزاد لکھتے ہیں کہ یہ وہی شخص ہیں جنہیں میر تقی نے پاؤ شاعر مانا ہے۔ یہ وہی لطیفہ ہے جسے آزاد نے نہایت فرصت میں تراشا ہے اور میر درد و سودا وغیرہ کے بارہ میں جگہ جگہ لکھا ہے ورنہ غریب میر نے تو اپنے تذکرہ میں ان کی نسبت یہ لکھا ہے "میر تخلص جوانے ہست بسیار اہل خوش طبع۔ ہر چند طرز علیحدہ دارد لیکن از خود کردن تخلص من نصف دلم از دو خوش ست" یہ غلط بیانی میر صاحب پر ایک بہتان صریح ہے۔

آزاد نے لکھا ہے کہ شاہ عالم کے زمانہ میں جب اہل دہلی کی تباہی حد سے گزر گئی تو ۱۱۹۱ھ میں لباس فقر اختیار کر کے لکھنؤ چلے گئے۔ یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ میر سوز پہلے نواب مہربان خاں رند کے یہاں فرخ آباد گئے۔ اور وہاں زمرۂ مصاحبین میں داخل ہوئے یہی وجہ ہے کہ نواب کی استادی میں انکا بھی نام لیا جاتا ہے اور نواب کا انتقال ۱۱۸۵ھ میں ہو چکا تھا۔ آزاد کو گلزار ابراہیمی کے تذکرہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ میں مقیم تھے۔ اسی پر قیاس کر کے انھوں نے یہ کہدیا۔ ورنہ اصل یہ ہے کہ ان کے جانے کے متعلق معلوم نہیں کہ کب وطن سے گئے تھے۔

آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ چلے گئے مگر وہاں سے ۱۲۱۲ھ میں ناکام مرشد آباد گئے۔ یہ بھی بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ ۱۱۹۱ھ سے ۱۲۱۲ھ تک اکیس برس کی مدت ہوتی ہے ———— کیا وہ اکیس برس تک ناکام تلاش معاش میں پھرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جب لکھنؤ پہونچے تو آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ مگر یہاں سے انکا جی گھبرایا تو مرشد آباد گئے۔ جب دوبارہ واپس آئے تو آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوگئے۔

ان کی شاعری کے بارہ میں آزاد لکھتے ہیں کہ انھوں نے غزل کے سوائے کچھ نہیں کہا۔ پھر انہیں کے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے لکھتے ہیں کہ ۱۲ سطر کے صفحہ سے ۳۰۰ صفحہ کا کل دیوان ہے۔ اسمیں سے دو سو اٹھاسی صفحہ غزلیات۔ باقی مثنوی۔ رباعی مخمس کہنے والا اس تھوڑی سی کائنات کو دیکھکر کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کا ذخیرہ بھی کافی تھا۔ مگر وہ انقلاب عالم کی زد میں آگیا اور محفوظ نہیں رہ سکا۔

آزاد میر سوز کی وفات ۱۲۱۳ھ میں لکھتے ہیں اور ستر برس کی عمر بیان کرتے ہیں حالانکہ یہ بات مختلف فیہ ہے۔ بینی صاحب اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ۱۲۱۲ھ میں بعمر اسی سال وفات پائی۔ نساخ کا بھی یہی قول ہے۔ نساخ ان کی جائے وفات لکھنؤ بتاتے ہیں۔ تذکرہ فیروز ۱۲۱۳ھ کی تائید کرتا ہے۔

آزاد، میر سوز کے تخلص کے بارہ میں بھی عجیب و غریب فضول اور مہمل روایات بیان کرتے ہیں اور مشاعرہ میں سوز کی

دریدہ دہنی کا ذکر کرتے ہیں مگر یہ سب باتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ جلسہ میں کسی نے باآواز بلند پوچھا کہ آپ کا تخلص کیا ہے تو انھوں نے فرمایا کہ صاحب قبلہ فقیر نے تخلص تو میر کیا تھا مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کمال کے سامنے میرا نام روشن نہ ہوسکے گا۔ ناچار سوز تخلص کیا۔ یہ ایک روایت ہے جس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ پہلے میر تقی میر نے یہ تخلص اختیار کیا تھا جیسا کہ وہ خود اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ:-

از خود تخلص من بتصرف دلم از د خوش است۔ یعنی چونکہ میرا تخلص انھوں نے رکھ لیا اس لئے میں ان سے کچھ ناراض ہوں

اہل تذکرہ کے بالاتفاق لکھا کہ میر سوز کے پڑھنے کا ایک خاص اسلوب تھا۔ مگر آزاد نے جو کچھ اس کے متعلق لکھا ہے وہ صرف اُن کی خوش بیانی ہے۔

میر تقی میر

آزاد لکھتے ہیں کہ میر صاحب سراج الدین علیخاں کے بھانجے تھے مگر اس طرح کہ جب اُن کی والدہ مرگئی تھیں تو اُن کے والد نے دوسرا عقد خان آرزو کی بہن کے ساتھ کیا تھا۔ یہ بالکل غلط ہے بلکہ معاملہ برعکس ہے پہلے خان آرزو کی بہن سے شادی ہوئی تھی بعد کو میر تقی میر کی والدہ سے۔ اس لئے کہ میر صاحب اپنی سوانحعمری ذکر میر میں لکھتے ہیں۔ کہ نادر شاہ کے حملے کے بعد پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے ماموں (یا خالو) سراج الدین علی خاں آرزو کا منت کش ہوا۔ ظاہر ہے کہ اگر خان آرزو کی ہمشیر سے ان کی والدہ کے مرنے کے بعد نکاح ہوتا تو وہ یعنی حافظ محمد حسن جنکا ذکر میر میں کئی جگہ تذکرہ ہے، ان سے بڑے کیونکر ہوتے دوسری جگہ لکھتے ہیں" باپ کے مرنے کے بعد دلی میں آئے اور خان آرزو کے پاس انھوں نے اور اُن کی شاعری نے پرورش پائی۔ مگر خانصاحب حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ۔ اس پر نازک مزاجی غضب "غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہوگئے۔ یہ واقعہ بالکل غلط ہے کسی مسئلہ وغیرہ پر کوئی جھگڑا نہیں ہوا بلکہ میر صاحب نے ذکر میر میں خود یہ واقعہ لکھا ہے کہ ——— بھائی محمد حسن کا خط خان آرزو کے پاس اس مضمون کا پہونچا کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے ہرگز اس کی تربیت میں سعی نہ کیجائے وہ عزیز (آرزو) واقعی دنیا دار شخص تھا اپنے بھانجے کے لکھنے پر میرے در پے آزار ہوگیا جب کبھی ملاقات ہوجاتی تو برا بھلا کہتا اور طرح طرح کی تکلیفیں پہونچانے کی کوشش کرتا رہتا۔ اور دشمن کی طرح میرے ساتھ پیش آتا تھا"۔ واقعہ صرف اتنا ہے جسے آزاد نے مذہبی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ صرف خانگی معاملات تھے جن کو اس قدر اہم بنا دیا۔ مگر یہاں بھی یہ شبہ باقی رہجاتا ہے کہ شاید اسی تعصب کی بنا پر انکی دل آزاری کی گئی ہو۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے میر صاحب عاشق مزاج تھے۔ یہی اوائل جوانی کی عشقبازی اُن کے بھائی کو آوارگی معلوم ہوتی تھی اور وہ ان کی اس حالت سے نہایت خفا تھے۔ ان کے عشق کا حال تذکرۂ بہار بیخزاں سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ میر صاحب کے بدنام اور رسوا ہونے کا ذکر یوں کرتے ہیں "بہ شہر خویش باپری تمثالے کہ از عزیزانش بود، در پردہ تعشق و میل خاطر داشت۔ آخر عشق از خاصۂ مشک بید اگر وہ میخواست کہ بخیہ بکار سوئی رسوائی میکند۔ حسن بے پردہ بجلوہ گری در آید از ننگ افشائے راز وطن اقربا با دل بغل پر دردۂ حیرت و حرماں و باخاطر ناشاد دست و گریبان قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبرآباد از خانہ برانداز بہا بہ شہر لکھنؤ رسید"۔ واقعہ دراصل یہ تھا۔ مگر آزاد کہیں سے کہیں پہونچ گئے۔

آزاد تذکرۂ شورش اور بزرگوں کی سنی سنائی باتوں اور سودا کے اس قطعہ کی جو ان کے کلیات میں نہیں ہے شبہ میں پڑتے ہیں کہ میر صاحب دراصل سید تھے یا نہ تھے۔ خود ہی اس شبہ کو مستحکم کرتے ہیں اور خود ہی ان کی سیادت کی توثیق فرماتے ہیں یہ عجیب واقعہ ہے ——— ذکر میر میں میر تقی کے والد کے نام کے ساتھ ہر جگہ میر عبداللہ لکھتے ہیں اور بیٹے کے نام کے ساتھ بھی میر شامل فرماتے ہیں جن کا نام میر فیض علی بتایا گیا ہے۔ مگر میر صاحب اپنے والد کا نام میر علی متقی اور بیٹے کا میر عسکری لکھتے ہیں۔ اس سے آزاد کے شبہ کا دفعیہ ہوتا ہے لیکن باپ اور بیٹے کے ناموں کی تحقیق باطل ہو جاتی ہے۔

آزاد ۱۱۹۰ھ میں اُن کا جانا بیان کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ لکھنؤ میں پہونچکر جیسا مسافروں کا دستور ہوتا ہے ایک سرائے میں اترے۔ معلوم ہوا کہ یہاں آج ایک مشاعرہ ہے رہ نہ سکے اور اسیوقت ایک غزل لکھی اور مشاعرہ میں جاکر شامل ہوئے" یہ واقعہ سرتاپا غلط ہے۔ ذکر میر میں خود میر صاحب نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ میں دلی سے بہت دل برداشتہ تھا اور چاہتا تھا کہ کہیں چلا جاؤں۔ کہ نواب آصف الدولہ بہادر کو میرا خیال ہوا کہ اگر میرے پاس میر آجائے تو اچھا ہے چنانچہ میرے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحٰق خاں موتمن الدولہ سے جو وزیر اعظم کے خالو تھے کہا چونکہ ان کے میرے خالو سے قدیم تعلقات تھے اسواسطے انھوں نے کہا کہ اگر نواب زادہ راہ دیں تو میر یہاں آجائے۔ انھوں نے حکم دیا اور خرچہ دیا۔ تا اینکہ یہ حکم مجھے پہونچا۔ میں تنہا دہلی روانہ ہوا۔ فرخ آباد پہونچا اس وقت یہاں مظفر جنگ برسر حکومت تھے۔ انھوں نے ٹھہرایا میں نہ ٹھہرا اور لکھنؤ آیا۔ سب سے پہلے سالار جنگ کے یہاں پہونچا اور انھوں نے بڑی عزت کی اور جو کچھ مناسب خیال کیا نواب کو اس کی اطلاع دیدی۔ چار پانچ روز بعد اتفاقاً نواب مرغوں کی لڑائی دیکھنے آئے میں بھی وہاں تھا ملا۔ نواب نے از روئے فراست مجھے پہچان لیا اور کہا کہ تم میر تقی میر ہو میں نے جواب دیا تو نواب بغلگیر ہوئے۔ اس کے بعد شاہی قیام گاہ پر پہونچے اور مجھے ساتھ لے گئے۔ اپنی غزل سنائی۔ سبحان اللہ کیا کہنا کلام الملوک ملوک الکلام۔ مجھ سے کلام سنانے کی فرمائش کی میں نے بھی ایک غزل کے چند شعر سنائے جب رخصت ہونے لگا تو سالار جنگ نے نواب سے کہا کہ اب حسب الحکم میر صاحب آگئے ہیں جیسا کچھ ارشاد ہو نواب صاحب نے فرمایا کہ دو تین روز میں کچھ مقرر کرکے اطلاع دیدوں گا دو تین روز بعد میں نے نواب کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا۔ اور پھر میں مقرر ہو گیا اور ہمیشہ نواب صاحب مجھ پر مہربانی فرماتے رہے۔

اب آپ خیال فرمائیے کہ کہاں آزاد کی یہ ہزیاں سرائی کہ خرچہ پاس نہ تھا تو ایک شخص کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ اس نے باتیں کیں تو میر صاحب خفا ہو گئے اور لکھنؤ میں گئے سرائے میں اترے اور مشاعرہ میں گئے اور قطعہ پڑھا۔ اور پھر نواب کو خبر ہو گئی۔ اور دو سو روپیہ ماہوار مقرر کر دئے اور پھر غزل کی فرمائش کی اور پھر دوسرے روز غزل کا تقاضہ کیا تو میر صاحب نے کہا کہ جناب عالی مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں ہیں۔ مچھلیوں کے کھیل تماشے پر نواب سے برہمی اور پھر درباری تعلقات سے انقطاع۔ اور پھر نواب نے انہیں بازار میں بلایا تو کہا بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ جنہیں آزاد نے آبحیات میں خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا ہے کہاں تک صحیح ہیں۔

آزاد نے لکھا ہے کہ نواب نے ان کی تنخواہ بند کر دی تھی۔ یہ واقعہ بھی بالکل غلط ہے۔ مرزا علی لطف اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں

"اگرچہ گرفتہ مزاجی سے اُن کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہوا۔ اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج تک کہ سنہ ۱۲۱۵ھ ہے وہی حال ہے" ظاہر ہے کہ جب یہ واقعہ غلط ہے تو انشا کا جانا اور دعوت کا روپیہ لیجانا۔ اور بلانا وغیرہ یہ سب باتیں باد رہوا ہوں گی۔

آزاد کہتے ہیں کہ امرا کی تعریف میں قصیدے نہ کہنے کا یہ بھی سبب تھا کہ توکل اور قناعت انہیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے میر صاحب کے یہاں آصف الدولہ بہادر کی مدح میں قصیدے موجود ہیں۔ رہا توکل اور قناعت اگرچہ ایسے باکمالوں کا شیوہ بھی ہے مگر میر صاحب تا حد مقدور امرا کی صحبتوں میں رہے ہیں اور برابر مصاحبین کے فرائض ادا کرتے رہے ہیں۔ تذکرۂ میر کو اٹھا کر دیکھئے اُس سے یہ سب حال آئینہ ہوجاتا ہے۔

آزاد نے میر صاحب کو مخمس کا موجد قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ میر صاحب کے یہاں واسوخت دو ہیں اور کچھ شک نہیں کہ لاجواب ہیں۔ اہل تحقیق نے فغانی و وحشی کو فارسی میں اور اردو میں انہیں واسوخت کا موجد تسلیم کیا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ میر صاحب کے یہاں واسوخت نہایت عمدہ ہیں مگر عمدگی کے یہ معنی نہیں کہ وہ موجد بھی مانے جائیں۔ چنانچہ اس بات سے انکار کرنا محال ہے کہ موجودہ طرز کا واسوخت صرف ایک مسدس ہے۔ مگر یہ تعین دشوار ہے کہ مسدس کے موجد میر صاحب تھے۔ یا اور کوئی

آزاد نے میر صاحب کی تصنیف نکات الشعرا پر عجیب طریقہ سے نگاہ ڈالی ہے اور اس کو ایک ہوا بنا کر پیش کر دیا ہے جس سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے صرف سنی سنائی باتیں لکھی ہیں اور اس تذکرہ کو وہ دیکھ نہیں سکے۔ لکھتے کہ دیباچہ میں میر صاحب نے یہ لکھا ہے۔ کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا۔ مگر اُن کو نہ لوں کا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ ان ہزار میں ایک بچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے اس کے حق میں فرماتے ہیں "وے شاعریست از شیطان مشہور تر" یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں آزاد نے اس تذکرہ کے متعلق لکھی ہیں۔ مگر آج پردہ اٹھ گیا اور تذکرہ ہماری نظر کے سامنے ہے۔ نہ تو اس میں یہ لکھا ہے کہ اس میں ایک ہزار شاعر کا ذکر لکھوں گا۔ نہ یہ کہ اُن کو نہیں لکھوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ بلکہ نہایت فراخ دلی سے کام لیا گیا ہے۔ کل سو سوا شاعروں کا حال ہے۔ جنمیں ایسے بھی ہیں جن کا صرف نام ہے کلام ہے باقی کچھ حال نہیں۔ ایسے بھی ہیں جن کی بابت کچھ یونہی سا حال اُن کو معلوم ہے اور صاف صاف لکھدیا ہے کہ مجھے اُن کی حالت سے کچھ اطلاع نہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں کہ جنہیں میر صاحب یہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ اوباش تھے۔ شعر و شاعری سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ مگر چونکہ شاعر تھے اس واسطے ان کا ذکر ضرور کیا گیا ہے۔ ان کی مثال میں عطا جعفر زٹل وغیرہ کو پیش کیا جاسکتا ہے

رہا آزاد کا یہ فقرہ کہ ہزار میں سے ایک بیچارہ بھی طعن و تشنیع سے نہیں بچا یہ بالکل غلط ہے حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب نے تذکرہ نویسی کا حق ادا کیا ہے۔ ادنیٰ ادنیٰ شعرا کی تعریفیں اس میں موجود ہیں۔ جس سے ان کے انکسار مزاج کا پورا حال معلوم ہوتا ہے۔ بعض بعض جگہ بے تعصبانہ نہایت مہذب طریقہ سے بے لاگ رائیں بھی دی ہیں۔ چنانچہ خاکسار۔ ثاقب۔ شیخ حاتم۔ انعام اللہ یقین۔ تابان۔ میر علی نقی۔ وغیرہ کے حال پڑھنے سے یہ حقیقت آئینہ ہوجاتی ہے اور اس وقت آزاد کے مندرجہ بالا نقرہ کا حال

لکھتا ہے انھوں نے کس قدر زیادتی کی ہے - ولی کے فقرے کی بابت ولی کے بیان میں ہم لکھ چکے ہیں اعادہ و تکرار بیکار ہے۔

آزاد لکھتے ہیں کہ سب تذکرے نالاں ہیں کہ اگر یہ غرور اور بے دماغی فقط امرا کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی - افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی ان کو دکھائی نہ دیتے تھے اس بات کا حال صحیح طریقہ سے اسی شخص پر کھل سکتا ہے جس نے میر صاحب کے تذکرے نکات الشعرا کو دیکھا ہو جہاں میر صاحب نے بلا امتیاز شخصیت نہایت فراخ دلی سے ہر اچھے کہنے والے کی داد دی ہے کتنا بڑا ظلم ہے آزاد کا یہ لکھنا کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔

اسی طرح میر قمرالدین منت اور سعادت یار خان رنگیں کی شاگردی کا قصہ بھی آزاد کی جولانی طبع کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے - ورنہ قمرالدین منت گو میر صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے مگر پھر بھی ان کے معاصر ضرور تھے وہ میر نورالدین نوید اور میر شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے - اور رنگین شاہ حاتم کے شاگرد تھے جیسا کہ ان کی مجالس رنگیں سے معلوم ہوتا ہے

آزاد نے سودا - خواجہ میر درد اور سوز کی شاعری کے متعلق لکھا ہے کہ میر درد کو آدھا اور سوز کو پاؤ شاعر مانتے تھے اس کا ذکر ہر ایک کے بیان میں آچکا ہے اب اعادہ بیکار ہے۔

اسی طرح نواب سعادت علی خاں کے عہد میں انکی دربار سے علحدگی وغیرہ کے حالات مشکوک ہیں گو ان کی صحبت نواب سے اچھی طرح سر برنہ ہوتی تھی پھر بھی علحدگی وغیرہ کا حال کہیں نہیں ملتا جیسا کہ ہم تذکرۂ لطف کا حوالہ دیتے ہوے اس سے پہلے لکھ چکے ہیں - کہ ۱۲۱۵ھ تک ان کی تنخواہ جاری تھی - جس کے بعد وہ دس سال تک زندہ رہے ——— آزاد نے میر صاحب کے دو تین شعر عطار کے لونڈے کے دیوان میں دیکھکر محلہ میں ایک عطار بھی پیدا کر دیا ہے اور اس کے لڑکے کو بنا سجا کر گزرگاہ نظر پر لا رکھا ہے مگر اسکا کوئی ثبوت ہم نہیں پہونچتا ان کی عادت ہے کہ جہاں کوئی شعر اپنے مطلب کا پاتے ہیں اس سے کام ضرور لے لیتے ہیں اور ایک گورکھ دھندا بنا کر پیش کر دیتے ہیں جسکے سلجھانے میں دوسرے تذکروں قیاس اور تاریخ کی ضرورتیں پیش آتی ہیں۔

غرضکہ میر صاحب کے تذکرہ میں آزاد نے جہاں تک ہو سکا ہے قیاس - افترا اور دروغ بیانی سے کام لیا ہے اور اسکے دیکھنے والوں کے واسطے ایک خوان نمکین تیار کر دیا ہے - اور بہت سے چھوٹے واقعات ایسے ہیں جن سے آزاد کی اس فطرت اتہام پسند کا پتہ چلتا ہے لیکن ان سب کا استقصا کون کرے۔

جرأت

آزاد نے انکا اصلی نام یحییٰ اماں لکھا ہے حالانکہ میر حسن - شیفتہ - نساخ - جنہیں سے حسن اور شیفتہ ان کے دیکھنے والوں میں ہیں کوئی سوائے قلندر بخش کے جرأت کا نام نہیں جانتا - مگر آزاد معلوم نہیں کس بنا پر اصلی نام یحییٰ اماں بتاتے ہیں۔

متعدد تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں چیچک کے عارضہ میں جاتی رہی تھیں - آزاد نے بھی اول میں یہی لکھا ہے مگر خدا جانے کس خیال سے مجبور ہو کر انہیں پھر بزرگوں کی بیان کی ہوئی حکایت یاد آئی ہے اور لکھا ہے کہ ”مشہور کرتے ہیں کہ پہلے وہ اصلی اندھے نہ تھے بعض ضرورتوں سے کہ شوخی عمر کا مقتضا ہے خود اندھے بنے رفتہ رفتہ اندھے ہی ہو گئے“ یہ حکایت ایسی ہے

کہ اسکا اعتبار عقلاً و نقلاً کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ گلشن بیخار میں لکھا ہے کہ "نیک و بد زمانہ کمتر دیدہ چشم از نظارہ بربست" نساخ لکھتے ہیں کہ "انیس برس کی عمر میں چیچک کے عارضہ سے انکی بصارت زائل ہوگئی" آزاد نے ان کو نہایت ہی اوباش مزاج بنا کر پیش کیا ہے مگر میر حسن جو ان کے دیکھنے والے ہیں لکھتے ہیں "دریں نوجوانی بسیار بحلم و حیا بسر مے برد خدایش سلامت دارد" آزاد نے اسیطرح لکھا ہے کہ میر تقی میر نے ان کی شاعری پر یہ رائے دی تھی کہ تم شعر تو کہہ نہیں سکتے ہو اپنی چوماچاٹی کہہ لیا کرو۔ یہ فقرہ بھی آزاد کی تصنیف ہے کیونکہ سوائے آبحیات کے کسی اور تذکرہ میں اس کا پتہ نہیں چلتا ——— دوسرے لطائف بھی قریب قریب ایسے ہی ہیں جسپر آزاد نے بھی عدم توثیق کا شبہ کیا ہے

میر حسن

آزاد نے لکھا ہے کہ میر حسن نے خواجہ میر درد۔ اور مرزا رفیع سودا کو غزلیں دکھائیں اور ان کے شاگرد رہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ میر حسن ضیاء کے شاگرد تھے۔ جب ان سے ان کی طرز نبھ نہ سکی تو مجبوراً ان بزرگوں کے رنگ میں کہنا شروع کیا جیسا کہ وہ خود اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں: "اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز او شاں از من کما حقہ سرانجام نیافت۔ بر قدم دیگر بزرگاں مثل خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر تقی میر رفتم" اس میں شک نہیں کہ اتباع بھی ایک قسم کی شاگردی ہے مگر صریحاً شاگرد لکھنا واقعات کو غلط کرنے سے کم نہیں ہے۔ آزاد نے لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے والد سے بھی اصلاح لی یہ بالکل غلط ہے۔ چنانچہ حسن میر ضیا کے بیان میں لکھتے ہیں کہ "اکثر شاعران آن دیار (عظیم آباد) اصلاح سخن از میر موصوف میگیرند بندہ ہم استفادہ سخن از آں بزرگوار حاصل نمودہ انشاء نقیر مولف کتاب ہمان است" حسن اوائل شباب میں دہلی سے نکلے تھے اس حالت میں کیونکر مانا جائے کہ میر درد سے انھوں نے اصلاح لی ہوگی۔

آزاد نے دوسرا ستم یہ کیا کہ کلام کی نایابی اور عدم دستیابی کیوجہ سے حسن کے کلام میں دوسرے حسن کا کلام شامل کر کے پیش کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ غزل ؎

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا　　کھڑا اسپہ میں جان وارا کیا

چار شعر کی ہے جو آبحیات میں درج ہے مگر دراصل یہ میر حسن کی غزل نہیں ہے بلکہ خواجہ حسن خلف خواجہ ابراہیم جو غیاث الدین مودودی کی اولاد میں تھے اور جعفر علی حسرت سے اصلاح لیتے تھے اس کے مصنف ہیں۔ خواجہ حسن لکھنؤ کے رہنے والے تھے بخشی طوائف سے تعلق تھا، ور مقطوں میں بالتزام بخشی کا نام لاتے تھے۔ چنانچہ اس غزل کے مقطع میں بھی وہی نام ہے ؎

کیا قتل اور جاں بخشی بھی کی　　حسن اس نے احساں دوبارا کیا

جرأت کے بڑے دوستوں میں تھے۔ چنانچہ جرأت نے ایک مثنوی خواجہ اور بخشی کے معاشقہ کے بیان میں کہی ہے۔ یہ غزل نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے خواجہ حسن لکھنوی ہی کے نام سے لکھی ہے۔ میر حسن کے دیوان میں اس غزل کا کہیں پتہ نہیں۔ آزاد نے میر حسن کا حلیہ بیان کرتے ہوئے ان کا قد میانہ لکھا ہے۔ مگر وہ ایک طویل القامت شخص تھے جیسا کہ تذکرہ گارسن ڈیتاسی میں مذکور ہے۔

سید انشاء اللہ خان

آزاد نے میر انشاء اللہ خاں کی بابت جو لطائف لکھے ہیں اس کے لئے تو کچھ لکھنا بیکار ہے اسواسطے کہ لطیفہ تو

لطیفہ ہی ہے اور اسمیں غلطیاں نکالنا ایک فضول سی بات ہے۔ البتہ دو تین باتیں ایسی ہیں جن کا لکھنا ضروری ہے اور جنپر آزاد نے ضرورت سے زیادہ اپنے زور بیان کو صرف کر دیا ہے۔ مصنف تذکرہ گلشن بیخار نے انشا کی نسبت جو بے لاگ رائے دی ہے وہ یہ ہے کہ "دیوانے دارد مشتمل اصناف سخن و ہیچ صنف دا بطریقہ راسخہ شعرا نہ گفتہ"۔ ظاہر ہے کہ انشا کے یہاں اکثر اصناف سخن موجود ہیں مگر ان کی شوخی طبع اور ہزالی سب میں اپنا کام کر رہی ہے انتہا یہ کہ تصوف جسمیں انھوں نے مثنوی شیر و برنج لکھی ہے اس میں بھی وہی رنگ ہے جس کا آزاد کو بھی اقرار ہے لکھتے ہیں کہ تصوف کو تمسخر کر دیا ہے۔ دوسری جگہ آزاد نے خود بیتاب کا قول بھی نقل کیا ہے جو یہ ہے کہ سید انشا نے فضل و کمال کو شاعری نے کھو یا۔ اور شاعری کو نواب سعادت علی خان کی مصاحبت نے ڈبویا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی وہ لکھتے ہیں کہ "نواب مصطفٰے خاں کا گلشن بیخار جب دیکھتا ہوں تو خار نہیں کٹار کا زخم دل پر لگتا ہے" یہ بالکل کھلی ہوئی عصبیت ہے جو انصاف اور حقیقت پر پردہ ڈال رہی ہے۔ حالانکہ خود آزاد بھی ———— ایک جگہ لکھتے ہیں "مگر عالم یہ ہے کہ ابھی کچھ ہیں ابھی کچھ ہیں۔ جو غزلیں یا غزلوں میں شعر با اصول نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی وہاں ٹھکانا نہیں۔ غزلوں میں غزلوں کی اصول کی پابندی نہیں"۔ ایک جگہ ضمناً ریختی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ریختی کا شوخ رنگ سعادت یار خاں رنگیں کا ایجاد ہے مگر سید انشا کی طبع رنگیں نے بھی موجد سے کم سگھڑ اپا نہیں دکھایا ہے"۔

آزاد کی اس رائے میں بھی بڑا کلام ہے۔ رنگین کو ریختی کا موجد کہنا آزاد ہی کی ایجاد ہے ورنہ اصل واقعہ نہیں ہے خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم میں ریختی کے متعلق یہ عبارت ہے کہ بعض کے نزدیک اس کا مخترع رحیم معاصر رحمان دہلی ہے جس کے یہ دو شعر ہیں ؎

ارے نادان تمیں اپنے سجن کو کیوں رُٹھایا ہے رُٹھا کر پیو کو جگ میں کسی نے ذوق پایا ہے
بہت پچھتاؤگی میری نصیحت مان کہتی ہوں سکھی کو رات سوتی ہے پیارے کو جو بھایا ہے

تذکرہ شعرائے دکن میں آصفی ملکاپوری نے۔ نیز تذکرہ دکن میں اردو وغیرہ میں ہاشمی بیجاپوری کے جو انشا اور رنگین سے صدیوں پہلے کے شاعر ہیں یہ دو شعر لکھے ہیں ؎

رضا گر مجھکو دیتی ہے کرونگی گھر میں جا دارو اگر مجھ ہو دیگی فرصت سحر پھر آونگی چھوڑ دو
اگر کوئی آکے دیکھے گا تو دل میں کیا کہیگا وہ مجھے بدنام کیا کرتے کہیں میں جا نگی چھوڑ دو

شعر الہند میں مولوی عبد السلام نے لکھا ہے "کہ مولانا ہاشمی کے بعد سید محمد قادر ایک باکمال شاعر گزرے ہیں جو غالباً دلی کے ہمعصر تھے اُن کا تخلص خاکی تھا اور ان کا مکمل دیوان ۱۱۸۲ھ کا لکھا ہوا مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کے کتبخانہ میں موجود ہے۔ اسمیں دو ایک ریختیاں بھی ہیں جو ہندی شاعری کا نمونہ ہیں"۔ ان تمام اسناد سے معلوم ہوتا ہے کہ موجد ریختی کے نہ انشا ہیں نہ رنگین بلکہ کوئی اور ہے صابر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "دیوان دوم کے دیباچہ میں (رنگین نے) ریختی کو اپنا ایجاد بیان کیا ہے۔ راقم کے عندیہ میں تو ادعائے محض ہے"۔

سید انشا اپنے طرز کی وجہ سے سخن سنجوں کی نظر میں بیحد سبک ہو گئے ہیں اس لئے آزاد نے چند فقرے لکھکر اس طرح ان

داغ بدنامی کو دور کرتے ہیں "لوگ کہتے ہیں کہ سید انشار کا کلام رندانہ ہے اور جو اس منزل میں ہزل ہے نہ بقدر نمک ہے بلکہ غذا کی مقدار سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے مگر اس کا سبب یہ ہے کہ حاکم وقت جابر ہے اور پسند عام اس کا واضع قانون ہے اوسوقت شاہ و امراسے لیکر گدا اور غربا تک انہیں باتوں سے خوش ہوتے تھے" آزاد کا یہ لکھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ انشار دو درباروں سے وابستہ رہے۔ ایک شاہ عالم۔ دوسرے سعادت علی خان ان دونوں بادشاہوں کے حالات مفصل لکھنے کی تو گنجایش نہیں مگر دیکھیئے تو معلوم ہوجائے گا کہ دونوں نہایت متین اور سنجیدہ مہذب تھے۔ بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ سعادت علی خان کے دربار سے علحدگی کا سبب اُن کا رندانہ مذاق ہی ہوا تھا۔ چنانچہ آگے چلکر ہم بیان کریں گے۔ اصل یہ ہے کہ انشا خود ایک رند لااُبالی تھے جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ اور جو جی میں آتا تھا کہتے تھے۔ آزاد کے حاشئے چڑھانے سے بدنامی کا داغ ان کے دامن سے دور نہیں ہو سکتا۔

———— اگر آزاد کا کہنا صحیح ہوتا تو میر و مرزا۔ مصحفی و منت وغیرہ جو اس وقت کے اکابر شعرا میں سے تھے سب کا کلام ایسا ہی کیوں نہ ہوتا۔ خود آزاد لکھتے ہیں "مثلاً اکثر میلوں تماشوں میں چلنے کے لئے کچھ احباب کا تقاضا کچھ ان کی طبیعت اصلی کا تقاضہ غرض انہیں جانا ضرور اور یہ سعادت علی خان کی طبع کے بالکل مخالف۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ اپنے کا غذات دیکھ رہے ہیں مصاحبوں کے ساتھ یہ بھی حاضر ہیں اس میں ایک آدھ لطیفہ بھی ہوجاتا انھوں نے عرض کی حضور غلام کو اجازت ہے وہ بولے کہ ہوں۔ کہاں انھوں نے کہا حضور آج آٹھوں کا میلا ہے۔ انھوں نے کہا لاحول ولاقوۃ "ایسی ایسی باتیں بعض موقع پر نواب کو موجب تفریح ہوتی تھیں بعض دفعہ بمقتضائے طبیعت اصلی مکدر ہو جاتے تھے"۔

آزاد نے انشا کی دیوانگی کے متعلق نہایت تخواری اور درد کے ساتھ ایک لمبی چوڑی روایت بیان کی ہے مگر وہ بھی غلط ہے کسی دوسرے تذکرے سے اسکی تائید کیا اور تردید ہوتی ہے۔ چنانچہ مصنف حیات دبیر نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشاء اللہ خاں کے نواسے تھے۔ کہ سید انشا نہ مجنون ہوئے نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے حکم دیدیا تھا کہ وہ سوائے دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں اور دربار میں بھی اس وقت حاضر ہوں جب اُن کو بلایا جائے۔ چنانچہ اُن کے اس شعر کو سند اً مصنف گل رعنا نے پیش کیا ہے۔

بدون حکم وزیر الممالک اے آغا　　چساں کنم حرکت نوکری ست یا بازی

اسی تذکرہ میں مولانا حکیم عبدالحی صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ آزاد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ بحالت دیوانگی مشاعرے میں گئے تو یہ غزل پڑھی اور کاغذ پھینک کر رخصت ہو گئے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں　　بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

حالانکہ یہ غزل ان کی اُس زمانہ کی ہرگز نہیں ہوسکتی جو اُن کے جنون اور بیچارگی کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے کیونکہ اس غزل کے چند شعر تذکرہ مصحفی میں بھی درج ہیں اور یہ تذکرہ اس وقت لکھا گیا ہے جب کہ سید انشار دلی ہو پنچے بھی نہ تھے بلکہ وہاں تک کا حال ہے کہ وہ مرشد آباد سے دلی آگئے تھے۔

میں نے تذکرۂ انیس الاحبا میں دیکھا ہے۔ کہ سید انشا چند روز مرنے سے پہلے تک مصنف تذکرہ مذکور کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ یہ تذکرہ غیر مطبوعہ ہے جسے موہن لال انیس نے راجہ ٹکیت رائے کے حکم سے لکھا اور اکثر شاگردان مرزا فاخر کیں کا اس میں ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آخر میں سعادت علی خاں انشا سے ناراض ہوگئے تھے مگر دیوانگی وغیرہ کی نوبت نہیں آئی۔

مصحفی آزاد نے مصحفی کی بابت لکھا ہے کہ ان کے چھ دیوان ہیں اور یہی عام تذکرے لکھتے ہیں۔ مگر تذکرۂ نساخ میں لکھا ہے کہ ان کے آٹھ دیوان ہیں۔ اس لحاظ سے آزاد نے جو صرف اپنی معلومات کی بنا پر لکھا ہے کہ آٹھ دیوان ہیں یہ کوئی نئی رائے نہیں ہے اس سے شاید یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ آٹھ دیوان کا راز صرف ہم جانتے ہیں۔

آزاد مصحفی کے کلام کی نسبت یہ رائے دیتے ہیں کہ مصحفی کا کلام کچھ زوردار نہیں ہے اور اس کو طرح طرح سے ظاہر کرتے ہیں۔ کہیں ان کے بڑھاپے پر اسابت کا الزام رکھتے ہیں کہیں انکی پرگوئی کو ملزم بناتے ہیں۔ کہیں ان کو امروہہ کا رہنے والا سمجھکر دیہاتی جانتے ہیں اور یہ سب اس وجہ سے ہے کہ سید انشا کو ان پر ترجیح دیجا سکے چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"یہ بھی مطلب کو بہت خوبی سے ادا کرتے ہیں مگر کیا کریں کہ وہ امروہہ پن نہیں جاتا۔ ذرا اکڑ کر چلتے ہیں تو ان کی شوخی ناز بے نمک معلوم ہوتا ہے سید انشا سیدھی سادی باتیں بھی کہتے ہیں تو اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ کہتا اور سنتا گھڑیوں رقص کرتا ہے۔ اور چٹخارے بھرتا ہے۔ ان کا یہ حال ہے کہ اصول سے ناپ کر اور قواعد سے تول کر بات کہتے ہیں پھر بھی دیکھو تو کہیں پھیکے ہیں کہیں میٹھے" ذرا انصاف سے دیکھئے کہ آزاد کی زبردستیاں ظلم کی حد پر پہونچی ہوئی ہیں یا نہیں۔ افسوس ہے کہ انشا کی غلط کاریاں ان کو محبوب ہیں مگر مصحفی کی احتیاط اور قواعد دانی تھی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ یہ ظاہر ہے کہ آزاد سے پہلے لوگوں پر بھی یہ بات ظاہر کی تھی کہ مصحفی امروہہ کے رہنے والے ہیں۔ بڈھے بھی ہیں پرگو بھی ہیں مگر وہ سب مصحفی کی نسبت یہ لکھتے ہیں "جمیع اصناف سخن پر قادر تھے" (نساخ) "بندش نظم میں اس کے صفائی اور شیرینی۔ اور معنی بندش میں اس کے بلندی اور رنگینی" (لطف) "طبع روانش جدول کتاب فصاحت۔ وفکر بیانش مسطر بیاض بلاغت۔ رنگینی نظمش سرخی باب گلستان و پیچیدگی الفاظش چوں سنبل بوستان" (میر حسن) یہ ہیں اکابر کی رائیں مصحفی کی بابت۔ مگر ع۔ ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیبے است۔ آزاد کو انشا کے سامنے جو باوجود سب باتوں کے مسخرے بھی تھے ایک متین اور زبردست شاعر کا کلام بے نمک معلوم ہوتا ہے ؎

بمیر تا برہی اے کہ ایں رنجے ہست | کہ از مشقت او جز بمرگ نتواں رست

رہا امروہہ پن۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا فیصلہ نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ دلی اور لکھنؤ والے ہمیشہ اسی بات پر ناز کرتے رہے کہ ہمارا وطن دلی ہے اور ہم لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ اور یہ کبھی غور نہ کیا کہ انپر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے | پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

غریب مصحفی اوایل شباب ہی میں دلی میں جارہے تھے اور وہیں کی ان کی زبان ہے دلی پر وہ فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی　ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

مگر آزاد کو یہ کچھ بھی قبول نہیں اور انہیں ان کے کلام میں جا بجا امروہہ پن نظر آتا ہے ــــــــــــــ

ــــــــــــــــــــ اور وہ مصحفی

کو انشا کے مقابلہ پر بُرا ہی جانتے ہیں۔ کوئی یہ سوال کرے۔ کہ حضرت امروہہ تو پھر بھی دہلی کے قریب ہے۔ مگر کشمیر۔ اور مرشد آباد جہاں انشا کے بزرگوں اور انشا کی عمر گزری، اُن کی نسبت جناب کا کیا خیال ہے تو یقین ہے کہ ان کو جواب نہ بن آئے گا خود حضرت آزاد سے پوچھا جائے کہ آپ دلی میں پیدا ہوئے مگر عمر بھر لاہور میں بسر کی۔ تو اب آپ کی زبان کو کیونکر مستند مانا جائے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ آپکی تصانیف میں جا بجا ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے لکھنو اور دلی والے دونوں کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔

مصحفی پر ایک یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ وہ میر کو اتنا بزرگ اور برتر مانتے تھے کہ کسی شعر پر داد دی تو اُٹھ سلام کئے اور اپنے کمال کا تمغا سمجھا اور اسی قسم کی بعض اور باتیں جو میر و مصحفی کی بابت ہیں۔ مگر انصاف یہ ہے کہ مصحفی کسی طرح میر سے کم نہ تھے وہ اپنے کمال کے آگے میر کو کچھ بڑا نہ جانتے تھے چنانچہ کہتے ہیں ؎

مجھ میں جرأت نہیں اے مصحفی تیغ زباں　میر و مرزا سے لڑانے یہ غزل جاؤنگا

انشا و مصحفی کے ہنگامے کو آزاد نے اس جوش و خروش سے لکھا ہے کہ دیکھکر ایک نبرد گاہ کا منظر نظر کے سامنے پھر جاتا ہے۔ مگر ہر جگہ یہ خیال رکھا ہے کہ لکھنو کو انشا ہی کا طرفدار دکھایا جائے۔

شیخ ناسخ آزاد نے اپنے تمام بیان کی بنا مولانا رعمی کی تحریر پر رکھی ہے۔ مگر اس میں بعض باتیں ہرگز قابل اعتبار نہیں ہیں۔ ایک وقت کھانا کھانا اور دفعتہً پانچ سیر کھا لینا۔ اور یہی روزانہ کا معمول ہونا۔ لکھنؤ کے ایک زبردست شاعر کو حیوان بنا کر پیش کرنا ہے۔ یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں جن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا"

یہ روایت کہ انھوں نے ایک بے معنی دیوان لکھکر رکھ لیا تھا بالکل غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کم سے کم دس بیس شعر تو اور مشہور ہوتے اس کی کوئی تذکرہ تصدیق نہیں کرتا۔

آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ نے اہل و عیال کا جنجال ہی نہیں رکھا تھا۔ یعنی انھوں نے شادی نہیں کی تھی مگر یہ صحیح نہیں ہے قیصر التواریخ میں سید محمد میرزا ئر نے لکھا ہے کہ ناسخ مرحوم نے بیٹوں کو بہت اچھی تعلیم دلوائی انکے ایک بیٹے کا نام زین العابدین بتایا ہے۔ جو مرزا حکیم محمد علی کا شاگرد تھا۔

آتش آزاد آتش کے متعلق لکھتے ہیں "مصحفی کے شاگرد تھے اور حق یہ ہے کہ اُن کی آتش بیانی نے استاد کے نام کو روشن کیا بلکہ کلام کی گرمی اور چمک دمک نے استاد شاگرد کے کلام میں اندھیرے اجالے کا امتیاز دکھایا" یہ فقرے ایسے ہیں کہ غور کرنے سے ہر شخص اس نتیجہ پر پہونچتا ہے۔ کہ آزاد کو سخن فہمی کا ملکہ قدرت کی طرف سے ملا ہی نہیں تھا مصحفی کا کلام اور آتش کے کلام کا موازنہ کیجئے تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ جو شخص ہندی نژاد ہو کر نظیری کے دیوان کا جواب لکھے

اپنے بعد دو تذکرے جو اصناف سخن پر تنقید سے معمور ہوں اور آٹھ دیوان ریختہ کے چھوڑ جائے اور ہر ایک صنف سخن پر قادر ہو۔ جو میر و مرزا کا مد مقابل ہو جس کی استادی پر بڑے بڑے نقادوں کا اجماع ہو اس کے حق میں یہ لکھنا کس قدر ستم ہے کہ آتش نے ان کے نام کو روشن کیا اور پھر لطف یہ کہ اگر کوئی بڑا فاضل یا کامل شاعر ہو اور اس کی شاعری کے بارہ میں کچھ غلو کیا جائے تو ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے نہ یہ کہ وہ شخص جس کے لئے ہر ایک نقاد کی یہ رائے ہو کہ وہ ایک بے علم اور کم لیاقت کے آدمی تھے اور سوائے غزل کے اور کسی صنف پر قادر نہ تھے۔ آتش کے کلام کو دیکھ لیجئے بہ استثنائے بعض اشعار۔ ابتذال۔ ناواقفیت فن۔ وغیرہ کا ایک وحشت آئینہ ہے جذبات اور فلسفہ کی بجائے رکاکت اور ابتذال کے دریا بہ رہے ہیں۔

آزاد لکھتے ہیں "دوستوں کی تاکید سے درسی کتابیں دیکھیں باوجود اس کے کافیہ کو کافی سمجھکر آگے پڑھنا فضول سمجھا" جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ کافیہ نحو عربی میں ایک انتہائی کتاب ہے۔ جس کے بعد درس میں صرف اس کی شرح پڑھائی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آتش نے عربی قواعد کی کتابیں کافی پڑھی تھیں۔ مگر آتش کے کلام کو دیکھئے تو انھوں نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں ایک معمولی درجہ کے مبتدی سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے۔ پھر آگے چل کر خود آزاد نے بیان کیا ہے کہ وہ اپنے مذہب کی موافق نماز کے طریقوں سے بھی واقف نہ تھے۔ ناسخ نے ایک مرتبہ اُن کو لکھا تھا۔

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب　　بو مسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب

آزاد نے لکھا ہے کہ وہ بالے خاں کی سرائے میں رہتے تھے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ بالے خاں کی کوئی سرائے لکھنؤ میں نہیں ہے بلکہ وہ پہلے نوازگنج کے قریب چوبٹیوں سے آگے مادھولال کی چڑھائی کے پاس مقیم تھے۔ لعد کو آخر عمر میں معالی خاں کی سرائے میں اُٹھ آئے تھے۔

مومن

مومن کے ساتھ آزاد نے سب سے بڑا ستم یہ کیا کہ پہلے ایڈیشن میں انکا نام ہی خارج کر دیا اور سرے سے ان کو اس قابل ہی نہ سمجھا کہ وہ آبحیات میں جگہ پا سکیں۔ مگر سخن سنجوں کی کمی نہیں۔ ملک نے اس فروگزاشت کے لئے سخت شورش کی تب جا کر کہیں آزاد نے چند عذرات لنگ پیش کرتے ہوئے اُن کو بھی دوسرے شاعروں کے ساتھ شامل کیا۔ اور وجہ یہ لکھی۔ کہ دور پنجم سے ان کا تعلق ہے بلکہ دور سوم و چہارم کو بھی اہل نظر دیکھیں جو اہل کمال اس میں بیٹھے ہیں، کس لباس و سامان کے ساتھ ہیں، کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان و شان اور وضع و لباس کے ساتھ ہو جو اہل محفل کے لئے خاص ہے نہ ہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے" آزاد کے یہ جملے ایک مورخ کی حیثیت سے نہایت ہی لچر اور لغو ہیں۔ یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ تذکرہ نساخ۔ اور شیفتہ جنہیں مومن کی نسبت یہ لکھا ہے" بزعم فقیر بقوت شاعری الیشاں کم کسے برخاستہ در ہر جنس سخن مکانتے وافی دارد کہ کسے را در یک صنف ہم میسر نیامدہ و باوجود تخالف ابسانین بہر دو لفظ چنداں دستگاہے نصیب او گشتہ کہ پارسیاں از آں خودی انگارند" (تذکرہ شیفتہ) جمیع اصناف سخن پر قادر تھے اشعار ان کے پُر مضمون و شیریں و عاشقانہ ہوتے ہیں راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں گزرا نہیں" (تذکرہ نساخ) پھر یہ دیکھتے ہوئے

کہ مومن ایسے باکمال کے لئے جو اپنے کسی معاصر سے کسی حیثیت سے کم نہیں تھا یہ لکھنا کہاں تک درست تھا۔ سوائے اس کے کہ آزاد کی اس فرو گذاشت کو اغراض ذاتی پر محمول کیا جائے اور کیا کہا جا سکے۔

آزاد نے لکھا ہے کہ میں نے مومن کے متعلق بہت سی روایتیں کم کر دی ہیں۔ کیونکہ نفس شاعری سے انکا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ اصول حقیقتاً "قابل تحسین" ہے۔ مگر کاش وہ دوسرے شعرا کے یہاں بھی یہی ملحوظ رکھتے۔ لیکن کیا کیا جائے ع

وقت کرم در بغل وقت دعا بر خدا

ذوق

اس میں شک نہیں کسی شے کی محبت انسان کو بہرا گونگا اور اندھا بنا دیتی ہے اور اس حالت میں عاشق کے لئے معاف ہے وہ جو کچھ کہے اسے معذور رکھا جائے گا۔ فردوسی نے شاہنامے میں ایسے ایسے جلیل القدر بادشاہوں کا ذکر کیا ہے جن کے سطوت و جلال کے سامنے بڑے بڑے لوگ سر تسلیم خم کرتے تھے۔ مگر پھر بھی وہ جہاں کہیں رستم کا ذکر کرتا ہے وہ مجبور ہو جاتا ہے اور اسکی نظر میں کسی کی کوئی وقعت نہیں رہتی مگر کیا کیا جائے وہ مجبور ہے معذور ہے جیسے رستم کی محبت نے اس کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اسیطرح آزاد جب ذوق کے تذکرے پر پہونچتے ہیں۔ تو وہ تذکرے جو دیکھنے والے نے بھی آنکھ دیکھے ہیں سب نقش باطل کی طرح نظروں میں ہیچ ہو جاتے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب برائے بیت تھا۔ در اصل لکھنے والے نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب ذوق کیلئے ہے۔ غریب بڈھا بادشاہ ظفر آزاد کی زد میں آجاتا ہے اس کی وہ تمام شاعرانہ کاوشیں جو اس نے ہر زبردست سے زبردست انقلاب میں قائم رکھی ہیں ضبط ہو جاتی ہیں۔ اسکی تمام سخن سنجیوں پر پانی پھیر دیا جاتا ہے اور اس کی تمام مملکت سخن کا ذوق ہی کو تاجدار تسلیم کر لیا جاتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ بادشاہ کی مشق سخن شاہ نصیر کے وقت سے جاری تھی اور وہ ذوق سے بہت پہلے سے اس بہار بے خزاں کی گلگشت میں مصروف تھے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ "اکثر اختراع و ایجاد ان کے ارادہ میں تھے اور بعض بعض ارادے شروع ہوئے مگر ناتمام رہے۔ کیونکہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ اتنا تھا کہ بات نکالتا اور اُسے نباہ نہ سکتا تھا۔ اُس کا کیا ہوا انہیں سنبھالنا پڑتا تھا۔ وہ اپنی غزل بادشاہ کو سناتے نہ تھے۔ اگر کسی طرح اُس تک پہونچ جاتی تو وہ اسی غزل پر خود غزل کہتا تھا۔ آپ اگر نئی غزل لکھ کر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا۔ ۷۰ برس کا سخن فہم تھا اگر اس سے چست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے ناچار اپنی غزل میں انکا تخلص ڈالکر" یہ فقرہ اور اسی قسم کے اور فقرے ذوق کے ذکر میں بھرے پڑے ہیں۔ مگر عقل سلیم رکھنے والے ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے کہ ۷۰ برس کا سخن گو استادی کے بل بازو پر عمر بھر رہا ہوگا۔ اس کو اگر ضرورت ہوئی ہوگی تو شاہ نصیر کے زمانے میں ہوئی گی مگر ذوق کے وقت میں وہ خود ایک کہنہ مشق تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ذوق نے انکی اصلاح میں پورے پورے تصرفات سے کام لیا ہو مگر اس کے یہ معنے نہیں ہو سکتے جو آزاد نے پیدا کئے ہیں۔

آزاد نے لکھا ہے کہ اکبر شاہ کو شعر و شاعری سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ گویا اکبر شاہ کو شاعری سے خارج ہی کر دیا ہے۔ حالانکہ در اصل واقعہ یہ ہے کہ اکبر شاہ کو بھی اردو شاعری کا اچھا خاصہ ذوق تھا۔ شاہ نصیر احسان وغیرہ ان کے درباری شاعر تھے اور وہ خود

ممنون کے شاگرد تھے ۔ شجاع تخلص کرتے تھے ۔ آزاد نے ایک اور بھی سخت ظلم کیا ہے۔ جسطرح شاہ نصیر کی اصلاح کو اڑا دیا ہے اسیطرح غالب کی محنت اور جگر کاوی کا بھی کہیں ذکر نہیں کیا ۔ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ جب استاد ذوق کا انتقال ہوا تو اس کے بعد مرزا غالب بادشاہ کے استاد ہوئے اور آخری دیوان اور تیسرے دیوان کا آخری حصہ انھوں نے دیکھا اور بنایا جیساکہ سخن فہم آج بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اول کے دو دیوانوں سے تیسرے اور چوتھے دیوان کا رنگ بالکل علحدہ ہے ۔ غالب کی یہ زبردست استادی تھی کہ اپنے کلام کی بادشاہ کے کلام کو ہوا بھی نہ لگنے دی اور جو کچھ انہیں دیا وہ ایسا ہے کہ آج اسپر کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا ۔

آزاد نے نواب الٰہی بخش خان معروف پر بھی بڑا ستم کیا ہے ۔ نواب صاحب کو انکا شاگرد بتایا ہے اور طرح طرح کے نمکین فقرے درج کئے ہیں مگر یہ ایک صریح اتہام ہے ۔ نواب سعید الدین احمد خان طالب مرحوم نے ایک مضمون کے ذریعہ سے اس کی پرزور تردید کی تھی افسوس کہ آج وہ مضمون میرے پیش نظر نہیں ہے ورنہ میں کچھ اور لکھتا ۔ اس وقت جتنے تذکرے موجود ہیں وہ اس بات پر متفق ہیں کہ وہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے ۔ اور کوئی شخص سہواً بھی آزاد کے ساتھ ہم نوا نہیں جو کہے کہ نواب مرحوم استاد ذوق سے بھی خفیہ مشورہ کرتے تھے ۔

آزاد نے غضب ہی کیا ہے کہ ان کے دونوں دیوان کے ساتھ ۔ تسبیح زمرد بھی جو نواب الٰہی بخش خاں کی عمر بھر کی کمائی تھی ذوق کی پروئی بتائی ہے ۔ مگر یہ ایک افتراء صریح ہے اور اس کا آزاد کی خوش بیانی کے سوائے دنیا میں اور کوئی ثبوت نہیں

غالب کے متعلق مجھے کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے مگر اس قدر کہ آزاد نے ان کو جابجا ذوق سے گھٹانے کی کوشش کی ہے مگر زمانہ نے اُسے قابل اعتنا نہیں سمجھا ۔ اور آج ذوق ذوق ہے اور غالب غالب ۔ آخر میں اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں نے آزاد کے شیرین استعارہ اور مبالغہ آمیز عبارت پر بھروسہ کر کے ——— واقعات کو صحیح سمجھا وہ سخت دھوکے میں ہیں ۔ آبحیات ، ایک دام فریب ہے جسکے تراشے ہوئے الفاظ اہل ذوق کو دعوت نظر دیتے ہیں مگر جاننے والے اور غور سے دیکھنے والے کو سخت مایوسی ہوجاتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ آزاد نے ایک لفظ بھی ذاتی مناقشات اور اغراض نفسانی سے جدا ہوکر نہیں لکھا ۔ اب تک اسبات پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ آزاد کی زبان کیا تھی ۔ عوام ان کو سحر گفتار سمجھے ہوئے ہیں ۔ حالانکہ حقیقتاً انکی زبان ہرگز قابل اعتماد نہیں ۔ اس میں غلطیاں بھی ہیں ۔ اور خلاف محاورہ الفاظ بھی ۔ چنانچہ اگر ضرورت ہوئی اور فرصت مل گئی تو آئندہ تفصیل کے ساتھ مقدمۂ آبحیات کی بے سروپائی ۔ اور آزاد کی زبان کی بے مایگی پر کچھ روشنی ڈالی جائے گی سردست ان تاریخی واقعات پر اکتفا کرتا ہوں

ہم خوش ہیں کہ آج ہماری زبان میں بعض ایسے تذکرے موجود ہیں جنھوں نے آزاد کی بہت سی غلط بیانیوں کے پردے اُٹھائے اور ان میں سے تذکرہ ۔ گل رعنا ۔ اور شعر الہند نہایت قابل قدر ہیں اور ہمکو اعتراف ہے کہ بہت سی مدد ان سے ہمکو ملی ۔ یہ بھی کہدینا ضروری ہے کہ جن تذکروں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ سب قریب قریب اس مضمون کے لکھتے وقت ہمارے پیش نظر تھے اور ہر جگہ اصل ہی سے کام لیا گیا ہے ۔ کہیں نقل پر بھروسہ نہیں کیا ۔

"نرگس"

ایک فلسفی کا انجام

(والٹیر کا ایک فسانہ)

ایک دن ممنون کے دل میں آیا کہ "مجھ کو فلسفی ہونا چاہئے اور فلسفی بھی ایسا کہ ساری دنیا میں میری شہرت ہو اور ہر شخص میری عزت کرے" پھر اس نے سوچا کہ یہ مقصود حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نفس کو برائیوں سے بچاؤں، اور ایسے مشاغل سے احتراز کروں جو خواہشات میں ہیجان پیدا کرتے ہیں. بلاشبہ یہ بہت دشوار امر ہے لیکن اس کی اولین تدبیر یہ ہے کہ محبت سے دور رہوں اگر کوئی جمیل عورت نظر بھی آئے تو مجھے اپنے دل کو یوں سمجھانا چاہئے کہ "اس کے رخساروں کی تازگی و رونق بالکل فانی چیز ہے اور چند دن میں زائل ہو جائے گی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کا جادو اور اس کے نگاہوں کی تڑپ عارضی ہے اور شباب زائل ہو جانے کے بعد ان میں سے کوئی کیفیت باقی نہ رہیگی، اسی طرح اسکا بلورین سینہ بھی ڈھل کر ایک نہ ایک دن بے معنی چیز ہو جائے گا، بال سفید ہو جائیں گے اور تیر سا قد بھی جھک کر کمان ہو جائے گا۔ دوسری احتیاط یہ ہونی چاہئے کہ مسکر چیزوں سے پرہیز کروں کیونکہ فقدان عقل، نقصان صحت اور تضیع اوقات کا بڑا سبب انہیں مسکر اشیاء کا استعمال ہوا کرتا ہے، اسی کے ساتھ کھانے کے مسئلہ میں بھی یہ التزام ہونا چاہئے کہ صرف اسی قدر کھایا جائے جتنی ضرورت ہے کیونکہ کھانا زندگی کے لئے ہے نہ کہ زندگی کھانے کے لئے۔ اس کے علاوہ چونکہ میری ضروریات کم ہیں اور دولت کافی ہے جو شاہی خزینہ دار کے پاس جمع ہے اس لئے میں استغناء کے ساتھ اپنی پوری زندگی بسر کر سکتا ہوں، نہ مجھے کسی حاکم کے پاس جانے کی ضرورت ہوگی، نہ میں کسی پر حسد کرونگا، نہ مجھ پر کوئی حسد کرے گا، خوش قسمتی سے بعض سچے دوست بھی مجھے ملگئے ہیں۔ میں کوشش کرونگا کہ یہ رشتۂ الفت قائم رہے، جب میں ان کے افعال و حرکات پر کوئی تنقید ہی نہ کرونگا تو پھر کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہوگا"

جب ممنون اپنی اس کارگاہ خیال سے فارغ ہوا اور تمام تدبیریں منضبط ہو گئیں تو اس نے اپنے کمرہ کا دروازہ بند کیا اور دریچہ کے پاس کرسی ڈال کر نہایت اطمینان سے بیٹھ گیا، گویا اس نے ان تدبیروں پر عمل شروع کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے دریچہ سے دیکھا کہ دو عورتیں اس کے گھر کے سامنے سڑک پر جا رہی ہیں جنمیں سے ایک بہت ضعیف ہے ——— لیکن اس کے چہرہ سے اطمینان ٹپک رہا ہے، دوسری بہت کمسن و جمیل ہے مگر اس کے بشرہ سے علامات قلق و اضطراب پیدا ہیں اور برابر رو رہی ہے اور جس قدر روتی جاتی ہے اس کا حسن و جمال زیادہ دلکش ہوتا جاتا ہے۔

اس منظر کا ہمارے فیلسوف کے قلب پر بہت اثر ہوا لیکن یہ اثر اس کے حسن کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ اس کا تو وہ عہد کر ہی چکا تھا صرف ہمدردی اس کا سبب تھا، یہ جلد ہی جلدی نیچے اتر کے گیا اور اس سے گریہ و زاری کا سبب دریافت کیا۔ لڑکی نے اپنے لب و لہجہ میں ہر ممکن تاثیر پیدا کرتے ہوئے اپنی داستان درد سنائی اور بولی کہ "میرے چچا نے میرا سارا سامان چھین لیا ہے اور میری

ساری میراث سے مجھے محروم کر دیا ہے، اسی کے ساتھ وہ مجھے سخت جسمانی عذاب میں مبتلا کرتا ہے، حتیٰ کہ میں جان سے بیزار ہوگئی ہوں اور سوائے اس کے کوئی چارہ کار سمجھ میں نہیں آتا کہ خود کشی کروں۔ آپ بہت ذی فہم انسان معلوم ہوتے ہیں اگر تکلیف نہ ہو تو زحمت کر کے گھر تک چلئے اور میرا سارا قصہ تفصیل سے سنئے، ممکن ہے آپ میری مدد کر سکیں"

ممنون اسپر راضی ہوگیا اور کوئی وجہ راضی نہ ہونے کی نہ تھی۔ جب یہ گھر پہونچے تو ممنون کو وہ ایک نہایت آراستہ کمرے میں لے گئی اور تخت پر بٹھا کر انتہائی حسن تاثیر کے ساتھ اپنا حال بیان کرنا شروع کیا، وہ روتی جاتی تھی اور حال بیان کر رہی تھی، حال بیان کرتی جاتی تھی اور اپنا سحر گفتگو بھی پوری طرح صرف کر رہی تھی۔ ممنون نہایت غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا اس کی دلکش اداؤں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اور نامعلوم طور پر دونوں میں فصل مکانی کم ہوتا جاتا تھا۔ ٹھیک یہی وقت تھا کہ دفعۃً دروازہ کھول کر لڑکی کا چچا اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرہ سے انتہائی غیظ و غضب ٹپک رہا تھا۔ لڑکی تو یہ دیکھکر بھاگ گئی اور ممنون مبہوت و متحیر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ یہ موقعہ ایسا نہ تھا کہ ممنون اپنے فلسفہ کی مدد سے نجات حاصل کر سکتا، اسلئے مجبوراً اس کو اپنی جان و آبرو بچانے کے لئے جو کچھ اُس کے پاس موجود تھا، لڑکی کے چچا کے حوالہ کر دینا پڑا۔

ممنون نہایت مجحوب و شرمندہ حالت میں گھر واپس آکر پڑا ہوا تھا کہ اس کے بعض احباب کی طرف سے دعوت طعام کا رقعہ آیا۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ "اگر میں گھر میں تنہا رہوں گا تو انکار کا اور زیادہ ہجوم ہوگا۔ کھانے کی بھی خواہش نہ ہوگی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ صحت پر خراب اثر پڑیگا، اس لئے چلنا ہی مناسب ہے، ممکن ہے اُن کی باتوں میں جی بہل جائے" چنانچہ وہ یہ سوچکر دعوت میں شریک ہوا اور وہاں احباب نے اس کے چہرہ پر آثار ملال دیکھ کر شراب پینے پر اصرار کیا۔ ممنون نے دل میں سوچا کہ "تھوڑی سی شراب جس سے یہ ملال دور ہو جائے چنداں مضر نہیں ہوسکتی بلکہ مفید ہوگی" اس لئے اُس نے اول اول چند جرعے پئے اور پھر آہستہ آہستہ جب احساس کند ہونے لگا تو اور زیادہ پینے کی خواہش ہوئی یہاں تک کہ پورا نشہ اس پر مستولی ہوگیا۔ عشاء کے بعد جب دوستوں نے جوا کھیلنے کی ترغیب دی تو اُس نے پھر یہ سوچکر کہ "احباب کے ساتھ اس قسم کے مشاغل تفریحی بُرے نہیں ہوتے" جوا بھی کھیلا اور اس حد تک کہ جو کچھ اس کے پاس تھا وہ ہار ا اور اس سے چہار چند کا قرض ہو گیا۔ اس کے بعد کسی بات میں نزاع پیدا ہوئی اور اس جھگڑے میں ایک شخص نے ایسی سخت ضرب اس کے چہرہ پر لگائی کہ ایک آنکھ پھوٹ گئی — اب یہ گھر واپس آیا لیکن اس حال میں کہ جو کچھ مال اس کے پاس تھا وہ ندارد ہو چکا تھا اس کا چوگنا قرض ہوگیا تھا اور ایک آنکھ بھی غائب ہو چکی تھی۔

دوسرے دن صبح کو اس نے اپنا خادم شاہی خزانچی کے پاس بھیجکر کچھ روپیہ طلب کیا تاکہ رات کا قرض ادا کرے لیکن خادم نے واپس آکر مطلع کیا کہ اُس نے اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے، اور اب ایک پیسہ بھی ملنے کی اُمید نہیں۔ یہ سنکر ممنون نے ایسا محسوس کیا جیسے اس پر بجلی گر گئی ہو وہ اُٹھا اور آنکھ پر پٹی باندھ کر قصر شاہی کی طرف روانہ ہوا تاکہ اس سے فریاد کرے اور شاہی خزانچی کے مکر و فریب کا حال بیان کرے۔

قصر شاہی میں پہونچا تو یہاں بہت سی عورتیں امرا کی نظر آئیں جنہیں سے بعض اُس کو جانتی تھیں اور انھوں نے پوچھنا شروع کیا کہ "ممنون تمہاری آنکھ کیونکر جاتی رہی" اس سوال سے اس کا غصہ اور بڑھتا جا رہا تھا، لیکن مجبوراً خاموش رہا اور کسی نہ کسی طرح قصر شاہی کے قریب پہونچکر زمین بوس ہوا اور درخواست پیش کی۔ بادشاہ نے اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ درخواست لیلے اور مضمون سے اطلاع دے۔ سکریٹری درخواست پڑھکر ممنون کو علحدہ لے گیا اور بولا کہ "تو مجھے کوئی بیوقوف مسخرا معلوم ہوتا ہے ورنہ بغیر میری وساطت کے درخواست براہ راست بادشاہ کے سامنے پیش کرنا کیا معنے رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ تو نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ کس شخص کی شکایت کر رہا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ میرا چچازاد بھائی ہے اور میری حمایت اسے حاصل ہے۔ اس لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ اس دعوے کو بھلا دو اور ٹھنڈے ٹھنڈے گھر جاؤ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری دوسری آنکھ سلامت رہے"

ممنون نے عہد کیا تھا کہ وہ محبت نہ کرے گا، مسکرات سے احتراز کریگا، جوا نہ کھیلیگا جو بنیاد ہے فساد کی اور امن و راحت کی زندگی بسر کریگا، لیکن چوبیس گھنٹے بھی نہ گزرے تھے، کہ ایک ایک کر کے اس کے تمام عہد باطل ہو گئے اور وہ ایک بدترین انسان کی حیثیت سے اپنے مکان کی طرف واپس آیا۔ جب یہاں پہونچا تو معلوم ہوا کہ عدالت کے لوگ اس کے گھر کی چیزوں کو باہر نکال کر نیلام کر رہے ہیں اور ممنون کے احباب جن سے اس نے قماربازی میں قرض لیا تھا وہاں موجود ہیں اور اپنے روپیہ کو اس طرح وصول کر رہے ہیں۔ یہ دیکھکر اس کو اس قدر سخت صدمہ ہوا کہ وہیں ایک درخت کے نیچے سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر میں اُس خوبصورت لڑکی کو اپنے چچا کے ساتھ ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ جب ان دونوں نے ممنون کو اس حال میں دیکھا تو قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔ غروب آفتاب کے بعد ممنون گھاس کے فرش پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا اور نہایت شدید تپ میں مبتلا ہو کر غافل سا ہو گیا۔ اس نے خواب میں ایک فرشتہ دیکھا جس کے نور سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں اور جس کے چھ حسین پر تھے۔ ممنون نے اس سے دریافت کیا "تم کون ہو"

—"تیرا محافظ فرشتہ"

—"تو پھر مجھ پر رحم کرو اور میری کھوئی ہوئی آنکھ، صحت، دولت اور عقل واپس دلادو"

—"ہم اپنی دنیا میں ان حادثات سے دوچار نہیں ہوتے"

—"اے متبرک روح، تیرا قیام کہاں رہتا ہے"

—"بہت دور، کرۂ آفتاب سے ایک ارب پچاس کروڑ میل کے فاصلہ پر، ایک نہایت چھوٹے سے ستارہ میں"

—"کیسا مبارک ہے تمہارا وطن کہ نہ وہاں مکر و فریب میں مبتلا کرنے والی لڑکیاں ہیں، نہ جھوٹے دوست جو مال بھی چھین لیں اور آنکھ بھی پھوڑ دیں، نہ خائن لوگ ہیں کہ دیوالہ نکال کر دوسروں کا مال ہضم کر جائیں اور نہ ایسے حاکم جو عدل د

(انصاف طلب کرنے پر بری طرح نکال دیں"

—— "خدا کا شکر ہے کہ یہ باتیں جن کا تم نے ذکر کیا ہے ہمارے ہاں نہیں ہیں۔ ہم عورت کی محبت کی طرف سے بھی محفوظ ہیں کیونکہ ان کی آنکھوں میں ہمارے لئے کوئی اثر نہیں ہے، نہ کھانے پینے کی افراط ہو سکتی ہے کیونکہ ہم کھاتے پیتے ہی نہیں نہ ہمیں مفلس ہونے کا ڈر ہے کیونکہ وہاں سونے چاندی کا وجود نہیں، نہ آنکھوں کے جانے کا ڈر ہے کیونکہ ہمارے جسم ہی نہیں ہے اور نہ ظلم وجور کا اندیشہ ہے کیونکہ سب مساوی درجہ رکھتے ہیں"

—— "لیکن اے محترم فرشتے، آپ اپنا وقت کس طرح بسر کرتے ہوں گے جبکہ آپ عورت کی معاشرت اور کھانے پینے کی چیزوں سے محروم ہیں"

—— "ہمارا وقت ان لوگوں کی امداد میں بسر ہوتا ہے جو ہماری حفاظت میں دئے گئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت میں تمہاری ہمدردی کے لئے آیا ہوں"

—— "افسوس، آپ کل کیوں نہ آئے کہ یہ مصائب مجھ پر نہ پڑتے"

—— "کل میں ایک تیرے دوسرے بھائی کی خدمت میں مشغول رہا جو شاہ ہندوستان کے پاس ملازم تھا اور وہ تجھ سے زیادہ مستحق اعانت تھا کیونکہ بادشاہ نے اس کی دونوں آنکھیں نکلوالی ہیں اور ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے زندان میں ڈالدیا ہے۔ بہرحال اب میں تمہاری مدد کے لئے آیا ہوں۔ تمہاری آنکھ تو البتہ واپس نہیں مل سکتی، لیکن اور تکلیفیں رفتہ رفتہ ضرور زائل ہو جائیں گی۔ اگر تم نے پھر کبھی فلسفی بننے کا قصد نہ کیا"

—— "تو کیا فلسفی بننا اس قدر دشوار ہے؟"

—— "ہاں، یہ ایسا ہی دشوار ہے جیسے حکمت وقوت، قدرت وسعادت میں کمال حاصل کرنے کی خواہش۔ یہ تمام کُرے جو فضا میں نظر آتے ہیں اور جن کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی ہے، یہاں ہر چیز تدریج کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ اور تم بھی اصلاح وافضل تدریج ہی کے ساتھ ہو سکتے ہو"

یہ سنکر ممنون نے ایک سرد آہ کے ساتھ کہا کہ "ہاں ہوگا، لیکن میں تو اس وقت تک اس کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ جب تک میری کھوئی ہوئی آنکھ نہ مل جائے"

نیاز

~·~·~·~·~·~·~·~·~

ضرورت ہے

جولائی، اگست ۲۵ء فروری و مارچ ۲۶ء کے نگار کی۔ (منیجر نگار لکھنؤ)

دیوان یقین

(مخطوطہ۔ انڈیا آفس۔ کتب خانہ لندن)

انعام اللہ خاں "یقین" اظہر الدین خاں دہلوی کے فرزند، مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد اور مخلص اور ممتاز اردو شاعری کے اُس دور کے غزلگو ہیں جس کے متعلق بہت سے امور ابھی تحقیق طلب ہیں اس دور کے شعرا کے حالات اور ان کا کلام اب تک پردہ ہی میں ہے اور شاید سوائے حاتم اور یقین کے دیوانوں کے فی الحال کسی اور کلام کی موجودگی کا عام طور پر علم بھی نہیں۔

یقین کی وفات کے متعلق تذکروں میں عجیب طرح کے فسانوی قصے درج ہیں۔ اگرچہ ہمارے اس مضمون کا مقصد یقین کے حالات زندگی سے بحث کرنا ہرگز نہیں ہے، تاہم ـــــ ابراہیم خاں کے تذکرہ گلزار ابراہیم (مخطوط برٹش میوزیم) کے مندرجہ ذیل الفاظ کا اظہار نامناسب نہ سمجھا جائے گا کیونکہ اس سے مرزا علی لطف کے تذکرۂ گلشن ہند کے اُن مبہم الفاظ کی وضاحت ہوجاتی ہے جو یقین کے متعلق علی ابراہیم کے انہی الفاظ کا ترجمہ ہیں اور علی لطف کے اور بہت سے ترجموں کی طرح شخص زیر بحث کے متعلق اکثر شبہات پیدا کردیتے ہیں۔

اس منقولہ عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوجائے گا کہ اردو میں مقفیٰ ترجمہ کرنے کی خاطر علی لطف نے علی ابراہیم کی سادہ سے سادہ عبارتوں کو کس مشکل اور پیچ در پیچ طریقوں سے پیش کیا ہے۔

پہلے علی لطف کی عبارت کو ہم ذیل میں بالکل انہی علامتوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں جو اُن کے مقفیٰ جملوں اور فقروں کو جدا جدا کرنے کی خاطر تذکرہ گلشن ہند (مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور ۱۹۰۶ء صفحہ ۱۸۵) میں لکھی گئی ہے۔

"مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں بہ سبب کسی حرکت نامعقول کے، کہ وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے باپ نے اسکے اس کو قتل کیا، اور نعش کو اس کی دریا میں بہا دیا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اس عمل شنیع کا گزرا تھا۔ اس کے باپ کے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں۔ یقین نے اس مقدمہ میں اکثر متنبہ کیا۔ ایک دن اس نے خفا ہو کر اس بچارے کا جی ہی لیا۔ علم غیب کا بدرستی خدا ہی کو ہے"

علی ابراہیم خاں کے اصل الفاظ (از مخطوط برٹش میوزیم ورق ۲۵۲-ب اور ۲۵۳-الف) اس امر سے متعلق یہ ہیں۔

"گویند بعہد احمد شاہ بادشاہ بنا بر امر نا ملایمی کہ از یقین صادر می شد اورا پدرش کشتہ بدریا انداخت و بعضے گویند پدرش ارتکاب امرے داشت کہ ممنوع

جمیع ادیان بود ——— او منع مینمود پدرش برآشفت و خونش بریخت"

—— ——

یقین کے کلام کے متعلق ان کے معاصرین میں ایک خیال یہ پھیل گیا تھا جیسا کہ بعض تذکروں سے ظاہر ہے، کہ در اصل مرزا جان جاناں اُن کے نام سے شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ لیکن یہ ایک مضحکہ خیز سی بات ہے۔ اگرچہ ایک سو سال پیشتر بھی اس سے انکار کیا جا چکا ہے لیکن اب خود یقین کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد کم از کم مجھے تو یقین ہو گیا ہے کہ یقین کے معاصرین نے غالباً حسد سے اس قسم کی افواہ مشہور کر دی تھی۔ وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ یقین جیسے نوجوان سے اس درجہ کا کلام غیر متوقع نظر آتا ہے۔ علاوہ اس کے تذکرۂ گردیزی کے دیکھنے سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ تذکرۂ گردیزی اس وقت تک طبع نہیں ہوا برٹش میوزم میں اس کا قلمی نسخہ میری نظر سے گزرا ہے اور اس نے یقین کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے، اس سے یہ الزام بالکل رفع ہو جاتا ہے۔ فتح علی حسینی گردیزی میر کی طرح یقین کا شناسا ہے اور یقین ہی کی زندگی میں اُس نے یہ تذکرہ لکھا تھا۔ یقین کے متعلق گردیزی کے خیالات ملاحظہ ہوں:-

"صاحب تلاش معانی رنگیں انعام اللہ خاں یقین پسر اظہر الدین خان بہادر مبارک جنگ، نبیرۂ حضرت شیخ مجدد الف ثانی است، و نواسۂ نواب حمید الدین خاں مرحوم۔ شہباز خیالش بصید معنی بلند پرواز است۔ و ہمائے اندیشہ اش بر قلۂ سخن بہ پر افشانی ممتاز۔ لی اعراف (؟) ریختہ گوئی را بر طاق طنز گزاشتہ و تخم معنی در زمین کاشتہ۔ و آنچہ از طبعش سرزدہ از فرطِ شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہ و السنہ جاری است۔ استفادہ سخن از افادہ میرزا جان جاناں مظہر گرفتہ چنانچہ گوید شعر

جون نماز اپنے پہ صبح و شام لازم ہے یقین ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ حضرت استاد یعنے شاہ مظہر کی ثنا

با مولف اخلاص دارد۔ و اکثر ہا بملاقات بہ دازد۔" (ورق ۵۷ مخطوطہ تذکرہ گردیزی - برٹش میوزیم)

معلوم ہوتا ہے کہ یقین اسی زمانہ میں مشہور بھی ہو گئے تھے کیونکہ گردیزی نے اور شعرا کے حالات میں بھی اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ ظہور کے ذکر میں لکھا ہے۔

"بخوش بیانی و نیکو بیانی مشہور ہست۔ در ریختہ تتبع دیوان انعام اللہ خان یقین میکند۔" (ورق - ۵۵)

عمدہ کے ذکر میں لکھا ہے:" در ریختہ تتبع انعام اللہ خان یقین می نماید

د شعر را بشستگی و رنگی می گوید" (ورق ۵۶)

خود یقین نے اس بات کا نہایت ایمانداری اور صداقت کے ساتھ اپنے اشعار میں اقرار کیا ہے کہ مرزا مظہر نے ان کی شاعری میں بے حد مدد کی اور اگر مظہر مدد نہ کرتے تو غالباً اُن کے شعر اس درجہ کو نہ پہونچ سکتے وہ لکھتے ہیں ؎

شعر خاطر خواہ مجھ سے ہو نہیں سکتا یقین
ہو جب استعداد ناقص پیر کامل کیا کرے

ساتھ ہی وہ یہ بھی ظاہر کر دیتے ہیں کہ میری اس ناقص استعداد کو درست کر کے مرزا مظہر نے خاصہ احسان کیا ہے اور شاید میرے سوا کوئی بھی ان کی قدر نہیں جان سکتا

مجھ سے پتھر کو کیا ہے جیوں نگین حرف آشنا
کون پہچانے یقیں بن حضرت مظہر کی قدر

اس کے علاوہ یقین اپنے اس عتقاد اور خلوص کا بھی اعلان کر دیتے ہیں جو انہیں مظہر کی ذات کیساتھ حاصل ہے اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مظہر نے کس طرح ایک صاحب ذوق نوجوان کو اپنی شاعرانہ قوتوں اور روحانی صفتوں کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں ؎

سایہ بے شخص ٹھہرتا نہیں، کہتا ہے یقیں
آپ سے مجھکو جدا حضرت مظہر نہ کرو

اس خلوص و عتقاد کے بعد ایک درجہ وہ بھی آتا ہے کہ یقین کو اپنے استاد کی ذات پر ناز ہونے لگتا ہے اور وہ اپنی شاعری کی خوبی یا خرابی کی داد صرف انہیں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ کوئی دوسرا ان کے شعر سمجھتا بھی ہے یا نہیں، بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ سوائے مظہر کے اور کوئی ان کی شاعری سے لطف بھی نہیں حاصل کر سکتا۔ کس مزے سے قسم کھا کر کہتے ہیں

یقین کی گفتگو کے لطف کو بات کب کوئی
بغیر از حضرت استاد مرزا جان جاں سمجھے

اس کے علاوہ یقین کے کلام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنی شاعری پر فخر بھی تھا وہ جہاں مظہر سے مستفید ہونے کا ذکر کرتے ہیں اپنی اس کامیابی کا بھی اظہار کر دیتے ہیں جو اس استفادہ سے انہیں نصیب ہوئی تھی اور ایک جگہ کہتے ہیں ؎

یقین تائید حق سے شعر کے میدان کا رستم ہے
مقابل آج اس کے کوئی آ سکتا ہے؟ کیا قدرت!

ایک اور جگہ اپنے کلام کے اثر کے متعلق نعرہ زن ہیں ؎

سخن کی سحر سے نزدیک ہے یقیں کہ کرے
مری زمین غزل دیکھ کر یہ گردوں رقص

اس تعلی کے ساتھ ہی ان کا خیال ہے کہ میں ریختہ گوئی کی طرف جس طرح چاہئے، متوجہ نہیں ہوا اگر متوجہ ہوتا تو اور بھی کمال حاصل کرتا کہتے ہیں ؎

نہ آیا سر فرو ادہر یقین کی فکر عالی کا
زمینوں کو وگرنہ ریختہ کی آسماں کرتا

اس قسم کے دعوؤں کے باوجود یقین کے دل سے کبھی اپنے استاد کے احسان کا خیال دور نہیں ہوتا وہ صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ

طبیعت شعر کی اصلاح بن فاسد ہی رہتی ہے
وہی سمجھے یقین یہ بات جو نبض سخن جانے

یقین کی شاعری اگرچہ صرف غزلوں تک محدود ہے، اعلیٰ درجہ کی ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، متاثر ہو کر لکھا ہے۔ پیشہ ور شعرا کی طرح ان کے یہاں بھرتی کے شعر نام کو نہیں۔ ان کے اشعار زبان حال سے کہتے ہیں کہ ہمارا لکھنے والا در اصل ایک حساس ہستی ایک محبت کا متوالا اور ایک پرجوش عاشق ہے۔

یقین نے عشق و محبت کے جن جذبات پر نہایت جوش اور ولولہ کے ساتھ اشعار لکھے ہیں ان پر ایک مفصل تبصرہ کرنا فرصت کا کام ہے اور شاید اردو غزلگویوں میں ایک اچھی سی جگہ حاصل کر سکتا ہے۔ سرسری مطالعہ میں جو اشعار اخذ کئے جا سکتے تھے وہ ذیل میں پیش ہیں ؎

میرا جو کام وفا تھا سو ہو سکا نہ یقین　　وگرنہ اس کی جفا میں تو کچھ قصور نہ تھا!
گزر جا وصل سے اگر ہجر میں دیکھے رضا انکی　　محبت میں یقیں! لیتا ہے نام مدعا کوئی؟
ناصحا یہ بھی کچھ نصیحت ہے؟　　کہ یقین یار سے وفا نہ کرے
حق مجھے باطل آشنا نہ کرے　　میں بتاں سے پھروں! خدا نہ کرے
سچ کہو اے بلبلو! کس باغ سے آتے ہو تم　　ہے ہماری بھی تمہیں کچھ آشیانے کی خبر
جو یار غیر کے ساتھ اس طرف سے ہو گزرے　　خدا کے واسطے کوئی مجھے خبر نہ کرے
بدلہ ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے　　اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
خلوت ہو اور شراب ہو معشوق خوب رو　　زاہد! تجھے قسم ہے، جو تو ہو تو کیا کرے؟
یقین مارا گیا جرم محبت پر، زہے طالع!　　شہادت اسکو کہتے ہیں! سعادت ہکو کہتے ہیں

شاید اس آخری شعر میں اپنی بےوقت موت کی طرف شاعر نے پیشین گوئی کی ہو!

زبان اور اسلوب بیان کے نقطۂ نظر سے بھی ہمیں یقین ایک اچھے شاعر نظر آتے ہیں اُن کی زبان نہایت صاف اور پاکیزہ ہے، اس قدر صاف اور پاکیزہ کہ اُن کے قریبی زمانہ میں سوائے سوز کے شاید کوئی ان کی اس بے ساختگی اور روانی میں ان پر فوقیت نہیں رکھ سکتا۔ بعض شعر مثالاً پیش ہیں۔

جو کچھ کہیں یہ تجھکو، یقیں! ہے سزا تری
بندہ جو تو بتوں کا ہوا، کیا خدا نہ تھا؟

دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس
کوچۂ یار میں کیا سایہ دیوار نہ تھا؟

تری جدائی میں کیا جفا اُٹھائی ہیں
مرے جو پاس تو آتا، وفا سے دور نہ تھا

پلّو کو اپنے یقین کی چشم گریاں پر نہ رکھ
مت کرائے گل آ بجو میں دامن رنگیں خراب

تری آنکھوں کی کیفیت کو میخانے سے کیا نسبت
نگہ کی گردشوں کو دور پیمانے سے کیا نسبت

بہار آخر ہوئی ہے اتو سینے دے گریباں کو
یقین! کرتا ہے کوئی اسقدر دیوانہ پن اپنکر

تو نہ تھا حیف یقیں! ورنہ دوا نہ ہوتا
آج اس طرح کا دیکھا ہے پریزاد کہ بس

زبان اور مطالب کی خوبیاں یقیں کے یہاں سخت سے سخت بندشوں میں بھی ہاتھ سے نہیں جانے پاتیں۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ فارسی کے آخری دور کی طرح شمالی ہند کی شاعری کے پہلے دور میں ردیف اور قافیہ کی سخت سے سخت بندشیں شروع ہوگئی تھیں یہ چیز بھی اردو شاعری کے مضر عناصر میں سے ہے یقین کی غزلیں قافیہ اور ردیف کی رنگینیوں سے معمور ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان کی ردیفیں بڑی بڑی بھی ہوتی ہیں۔ بعض زمینوں کے ردیف و قافیے ملاحظہ ہوں۔

۱ رنجور رو دینا۔ کافور رو دینا
۲ کھانے کے کام آتا۔ بت خانے کے کام آتا
۳ آسمان کے ہاتھ کیا آیا۔ باغباں کے ہاتھ کیا آیا
۴ گلزار کیوں ہوتا۔ دلدار کیوں ہوتا۔
۵ پروانہ سے کیا نسبت۔ غم کھانے سے کیا نسبت
۶ آزاد کیا کیئے۔ بیمار کیا کیئے
۷ داد کو پہونچے۔ فصاد کو پہونچے
۸ صیاد کے آگے۔ فریاد کے آگے۔

اس زمانہ کے اور شاعروں کی طرح یقین کے کلام میں بھی وہ الفاظ اور ترکیبیں موجود ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ متذکرہ اشعار میں اس قسم کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ ایک دو یہاں بھی پیش کی جاتی ہیں۔

بتاں خوں کرکے میرا سب لگے آپس میں یوں کہنے ۔۔۔ یہ کافر جیتا رہتا تو بت خانے کے کام آتا

نہیں معلوم اب کی سال پیمانہ پہ کیا گزرا ۔۔۔ ہمارے توبہ کرنے سیتے میخانہ پہ کیا گزرا

خوباں یقین کو معذور اب تو رکھو کہ اسکے ۔۔۔ لوہو نہیں جگر میں آنسو نہیں نہیں میں

یقین کی غزلوں کو آخری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کسی غزل میں پانچ سے زیادہ یا کم شعر نہیں۔ شاید یہ بات عجیب سی ہے۔

یقین کے کلام کے اس مخطوط میں کل ۲۹ ورق ہیں۔ تقطیع ½ ۱۰ × ½ ۶۔ خط نسخ۔ عبد الرزاق خاں نے ۱۱۹۵ھ میں نقل کیا۔ اسپرنگر کی "فہرست کتب خانجات شاہ اودھ" کے صفحہ ۲۴۶ میں یقین کے ایک اور دیوان کا ذکر ہے جو ۱۱۵۵ھ میں لکھا گیا تھا

سید محی الدین قادری

(ام، اے ام، ار، اے، اس (لندن))

اب بھی وقت ہے

کہ آپ "ظریف شاعروں کا تذکرہ" نصف قیمت پر حاصل کر سکیں یہ تذکرہ تقریباً ..۲ صفحات پر شایع ہوگا اس کی قیمت (للعہ) سے کم نہ ہوگی۔ لیکن اگر آپ نے اشاعت سے قبل دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیجدئے تو آپ اتنی ہی رقم میں اس کے پانے کے مستحق ہو جائیں گے۔ یہ تذکرہ بقدر مکمل۔ دلچسپ۔ اور نئی چیز ہے کہ زبان اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔

سیکڑوں ظریف شاعروں کے حالات ان کے لطائف وظرائف اور انکا ظریفانہ کلام جو ہزاروں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی آپ کو نہیں نظر آسکتا۔ برسوں کی محبت وکاوش کے بعد ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے اور آپ اشاعت سے قبل اُسے صرف دو روپے میں حاصل کر سکتے ہیں اشاعت کے بعد پھر کوئی رعایت نہ ہوگی یہ کتاب سوائے ہمارے اور کہیں نہیں مل سکتی۔ بقول فروش ایجنٹ اور کتب فروش بھی اس رعایت سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں ورنہ اشاعت کے بعد ان کو زیادہ سے زیادہ (۲۰) فیصدی کمیشن ملیگا۔

بغیر روپیہ وصول ہوئے کوئی آرڈر درج رجسٹر نہیں کیا جائے گا۔

مینیجر "نگار" نظیر آباد لکھنؤ

بیگار

فسانہ

"مہاراج! اس بیلے (وقت) تو مور (میرا) جی جرا (ذرا) کھراب (خراب) ہے ماف (معاف) کر دیؤ" یہ کہکر بڈھا جگنا کرا ہنے لگا۔

مہاراج رام اوتار تھے تو چار روپے کے پیادہ لیکن مزاج ان کے زمینداروں سے بھی بڑھے ہوئے تھے ان کو جگنا کے حال زار پر کچھ بھی رحم نہ آیا بگڑ کر بولے "میں اسوقت تیری بات نہ مانوں گا اگر تو اپنی خیر چاہتا ہے تو سیدھے سیدھے میرے ساتھ ضلع تک چل وہیں کارندہ صاحب کے سامنے فریاد کر لینا"

جگنا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے پھر کہا۔ "آج تو مورے حال پر دیا کرو کوئی اور بیگار پکڑ لو"۔ "نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا آج تیری باری ہے تجھکو چلنا پڑے گا"

جگنا کی عورت "بیکی" ایک طرف بیٹھی ہوئی مونج کوٹ رہی تھی اُس نے "مونگری" ہاتھ سے رکھدی اور بولی "ان کو تو کال (کل) سے بڑے جور کا بکھار (بخار) چڑھا ہے چلہو نہیں سکت ہیں (چل بھی نہیں سکتے) مہاراج اپنی "لودہ بندی" لاٹھی سے زمین کریدتے ہوئے گرجے "حرامزادی تو کیوں ٹر ٹر کر رہی ہے" جگنا نے بات بڑھتی دیکھکر اپنی عورت کو ڈانٹ بتائی اور مہاراج سے کہا "مہرارو (عورت) کی بات کا تم کچھ خیال نہ کرو رام دے مورے ماں تنکو جور ہوت تو میں جرور چلتیوں (اگر مجھ میں ذرا بھی طاقت ہوتی تو میں ضرور چلتا) ٹھیک اسی وقت جگنا کا لڑکا مصریا گھر میں گھسا۔ پٹھا نہ تھا بالکل الھڑ پورے چھ فٹ کا قد۔ کسرتی بدن۔ شباب کا عالم مہاراج کی باتیں سنکر اُس کو غصہ آگیا اور بول اٹھا۔ "دیکھت تو ہو کہ بابا کا جی کھراب ہے ایسا جلم تو نہ چاہی (دیکھتے تو ہو کہ میرے باپ کا جی نہیں اچھا ایسا ظلم تو نہ کرنا چاہیے) مصریا کی یہ مجال کہ وہ پیادہ سے زبان لڑائے۔ چمار کی یہ ہمت کہ وہ مہاراج کو آنکھیں دکھلائے۔ بیکی کی بات ہی سے مہاراج کا مزاج بگڑا ہوا تھا مصریا کی باتوں نے ان کے تن بدن میں آگ لگا دی اُنھوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ چمرودا جوتا اتار کر مصریا کے سر پر جا دیا اسی گڑبڑی میں مہاراج کی لاٹھی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی مصریا نے اپنا سر بچانا چاہا اتفاق سے لاٹھی اچٹ کر مہاراج کے سر میں لگ گئی بس اب کیا تھا۔ مہاراج نے مصریا کو مارتے مارتے زمین پر لٹا دیا جب تھک گئے تو گالیاں دیتے ہوئے "ضلع" کو واپس ہوئے جاتے وقت یہ دھمکی بھی دیتے گئے "دیوان جی سے کہکر تم لوگوں کو قید نہ کرا دیا تو میرا نام رام اوتار نہیں"

مہاراج چلے گئے تو اب پڑوسیوں نے آکر جگنا کو گھیر لیا "کیا ہوا؟ مہاراج کیوں بگڑ گئے؟" جگنا تو خاموش رہا لیکن بیکی خوب چیخی چلائی۔ سب لوگوں نے زبانی ہمدردی سے کام لیا اس سے زیادہ وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ زمیندار کے پیادہ اور ایک

بیچ اسامی کا معاملہ تھا اگر ساتھ دیتے تو ان کا بھی وہی حال ہوتا جو مصریا کا ہوا تھا۔ ایسے واقعات تو گاؤں میں روز ہی ہوا کرتے ہیں جب بڑ دمیوں بھی میدان صاف ہوگیا تو میکی نے جگنلے سے کہا۔ "اب کا ہوئی (اب کیا ہوگا) مصریا بیچ ہی میں بول پڑا "ہوئی کا۔ زیادہ دکھ دیہیں تو ڈپٹی صاحب سے جاکر فریاد کرہیوں۔ سرکاری عملداری ہیں ایسا جلم نہیں ہو سکت۔ جب سے میں لال گنج میں کسان سبھا دیکھ آیو ہوں اب کوؤ سے نہیں ڈرتیوں (ہوگا کیا اگر زیادہ تکلیف دیں گے تو ڈپٹی صاحب سے جاکر فریاد کروں گا سرکاری عملداری میں ایسا ظلم نہیں ہوسکتا۔ جب سے میں نے لال گنج میں کسان سبھا دیکھی ہے اب کسی سے نہیں ڈرتا)" جگنانے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں تیں تو بڑا سورما ہے جب نہیں مٹھاجات۔ مہاراج رسیائے کے (خفا ہوکر لگے گئین) ہیں اب جو کچھ نہ ہوے وہ تھوڑا ہے۔"

۲

برسات ختم ہوگئی تھی شروع جاڑے کا مہینہ تھا تالابوں کا پانی خشک ہوچلا تھا کنول کا پھولنا کم ہوگیا تھا صبح کے وقت زمین شبنم سے بھیگنے لگی تھی، شام کو گاؤں کے اوپر دھواں منڈلانے لگا تھا اس وقت صبح کا وقت تھا۔ سردی سے کانپتے ہوئے دیہاتی لڑکے سورج دیوتا سے باہر نکلنے کی التجا کر رہے تھے ایک ساتھ بچے چلا اٹھتے تھے "اللہ میاں گھام (دھوپ) کرو بادل (بدری) اسلام کرو" پنگھٹ پر گاؤں کی البیلی عورتیں جمع ہوگئی تھیں۔ پانی بھرنے کے لئے نہیں بلکہ ہنسی مذاق کرنے کے لئے۔ کوئی کلسہ کو کنویں میں ڈالے اپنی بوڑھی ساس کی نقل کر رہی تھی تو کوئی اپنی سکھی سے دیدے مٹکا مٹکا کر راز و نیاز کی باتیں کر رہی تھی۔ بوڑھی عورتیں اپنے پوتوں کو گود میں لئے دروازے پر کھڑی اپنی بہوؤں کو کوس رہی تھیں کہ اتنی دیر ہوگئی اب تک کنوئیں سے نہیں لوٹیں پنگھٹ کے سرے پر ایکھ والے کھیت کے اس طرف خوشنما کھپریلوں کا ایک کچا مگر نفیس مکان تھا گاؤں والے اس کو "جلہ" (ضلع) کہتے تھے اس ضلع میں موضع "بھدین" کے کارندہ لالہ سالک رام رہا کرتے تھے۔ "بھدین" ضلع مرزاپور کا ایک غیر معروف گاؤں ہے اس گاؤں کے زمیندار کنور دلپت سنگھ شہر مرزاپور میں رہتے تھے انہیں اپنے عیش و آرام سے کام تھا کبھی بھولے بسرے بھی "بھدیں" میں نہ آتے تھے۔ لالہ سالک رام ان کے باپ کے وقت کے کارندے تھے اسی وجہ سے کنور صاحب کو لالہ جی پر بڑا اعتبار تھا۔ کبھی کنور صاحب کو ایک بیگار کی ضرورت ہوتی تو لالہ جی دس بیگار بھیج دیتے۔ فصل پر آم۔ جامن۔ کٹھل میوہ۔ اناج اور بھوسہ کی گاڑیاں بھی پہنچا دیتے۔ کنور صاحب اسی میں خوش ہوجاتے۔ "بھدیں" میں پٹی داری کا بھی جھگڑا نہ تھا کل گاؤں کے بلا شرکت غیرے لالہ جی ہی مالک تھے تنخواہ تو کل بارہ روپیہ تھی لیکن اوپر کی آمدنی سے مالامال تھے۔ اضافہ لگان اور بیدخلی سے وہ اسامیوں کا خون چوس لیتے تھے۔ جہاں کسی اسامی نے نذرانہ دینے میں کچھ حیلہ کیا اور انھوں نے لگان بڑھا دیا۔ مہاراج رام اوتار اور بھیا پاسی ان کے دو پیادے تھے۔ یہ ڈال ڈال تھے تو وہ پات پات۔ جس وقت مہاراج رام اوتار مصریا چمار کو پیٹ پاٹ کر ضلع پر واپس ہوئے تو اس وقت لالہ سالک رام "الاؤ" کے سامنے ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے آگ تاپ رہے تھے۔ کبھی کبھی "جمعبندی" کی

ورق گردانی بھی کرتے جاتے تھے ان پاس ہی زمین پر "دلو" چودھری اور منشی جمال الدین بیٹھے ہوئے تھے سمیا پاسی ایک طرف بیٹھا ہوا گانجے کا دم لگا رہا تھا۔ مہاراج کو دیکھکر لالہ جی نے پوچھا "کیوں مہاراج بڑی دیر لگائی کیا کوئی بیگار نہیں ملا ڈپٹی صاحب کے ڈیرہ پر اگر دو گھنٹے کے اندر گھاس نہ پہنچی تو مصیبت آجائیگی"

گاؤں والے اپنی اصطلاح میں کارندہ صاحب کو "دیوان جی" کہتے تھے مہاراج نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ "دیوان جی اب تو گاؤں میں رہنا نہ ہوگا"

"کیوں! کیوں! خیریت تو ہے"

جب چمار بھی اکڑنے لگے تو اب کیسے کام چلے گا۔ میں آج صبح اُٹھتے ہی جگنا چمار کو بلانے گیا تو وہ بہانہ کرنے لگا کہ میری طبیعت خراب ہے میں اس سے باتیں کر رہا تھا کہ اس کا لڑکا مصریا آگیا اور وہ مجھ سے لڑ پڑا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں آپ کا خیال کرکے چپ ہوگیا۔ نہیں تو مارتے مارتے سالے کا دم نکال دیتا"

دلو چودھری بول اُٹھے "مصریا کو تم ایسا ویسا نہ سمجھو وہ تو کسان سبھا میں بھی جاتا ہے۔ بڑا پاجی ہے" منشی جمال الدین کیوں خاموش رہتے۔ کارندہ اور پیادوں کی خوشامد ہی سے تو گاؤں میں عزت ہوتی ہے کہنے لگے "درین چہ شک۔ واقعی ان چماروں کی ذات بھی اس قابل ہے کہ جب تک ان کی اُٹھتے بیٹھتے خبر نہ لی جائے اُن کا مزاج درست نہیں ہوتا"

سمیا پاسی کیوں سب سے پیچھے رہتا۔ ایک مرتبہ اس کی بکری جگنا کے کھیت میں چلی گئی تھی تو مصریا نے سمیا کی خوب خبر لی تھی۔ اس کا بدلہ لینے کا تو یہی موقع تھا۔ چلم کو ایک طرف زمین پر رکھتے ہوئے بولا "مہاراج بڑی چوک بھئی۔ موکا (مجھے) اپنے ساتھ لیلیتو (لے چلتے) تو ہیں مصریا کی ہیکڑی بھلائے دیتوں (دیتا) دیوان جی حکم ہو تو جاکر ان دونوں چماروں کو پکڑ لاؤں"

دیوان جی نے سر ہلا کر کہا۔ "ابے ہاں۔ پوچھتا کیا ہے ابھی جا اور ان دونوں کو پکڑ لا"

مہاراج نے کہا "میں بھی چلتا ہوں"

دونوں پیادے کندھوں پر لاٹھی رکھے ہوئے جگنا کی منڈیا پر پہنچے۔ میکی کہیں سے ہلدی مانگ لائی تھی اس کو پیس کر لاؤ کے سامنے بیٹھی ہوئی مصریا کے بدن پر لگا رہی تھی۔ جگنا ایک طرف پوال پر پڑا ہوا پھٹی پرانی "کتھری" اوڑھے کراہ رہا تھا۔

سمیا نے پکارا "ابے او جگنا۔ ابے او مصریا چل تو کا دیوان جی بلاوت ہیں (چلو دیوان جی بلاتے ہیں)"

اس مرتبہ جگنا کی آہ وزاری نے کچھ کام نہ دیا۔ مصریا اور جگنا کو دونوں پیادے کشاں کشاں "ضلع" کی طرف لے چلے پیچھے پیچھے میکی بھی۔ "سنکٹا دیوی" کی منتیں مانتی ہوئی روانہ ہوئی۔ گاؤں کے تماشائی بھی ساتھ ہوئے۔ جب یہ سارا قافلہ ضلع پر پہونچا تو تماشائی باہر ہی رہ گئے احاطہ کے اندر جانے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ "کر گہ چھوڑ جلاہہ جائے۔ ناحق چوٹ بیچارہ کھائے" والی مثل سے وہ لوگ خوب واقف تھے۔

۳

آج کل حاکم پرگنہ دورہ پر تھے "بھدین" کے قریب ہی ایک باغ میں ان کا خیمہ لگا تھا چونکہ ڈپٹی صاحب ابھی حال ہی میں تبدیل ہو کر آئے تھے۔ ہر شخص ان کو خوش کرنے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ پرانے ڈپٹی صاحب سے تو لالہ سالک رام کی جان پہچان تھی لیکن نئے ڈپٹی صاحب سے ناواقف تھے پھر بھی اُنکو خوشی تھی کہ پیشکار صاحب جو ان کے پُرانے دوست ہیں چنانچہ پیشکار صاحب نے جب کہلا بھیجا کہ بیگار کی ضرورت ہے تو فوراً اس کا انتظام فوراً کر دیا لیکن احتیاطاً ایک اور بیگار لانے کے لئے مہاراج رام اوتار کو حکم دیا لیکن آج سویرے سویرے ہی زندگی بھر میں پہلی مرتبہ دیوان جی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا غصہ میں بھرے بیٹھے ہی تھے کہ جگنا اور مصریا اُن کے سامنے پیش کئے گئے تمام غصہ انہیں سرکشوں پر نکالا اور چلا کر بولے "کیوں بے حرامزادو اب تم لوگوں کی یہ ہمت ہو گئی ہے کہ مہاراج سے جھگڑا کرنے لگے ہو دیکھو اب میں تمہاری کیا گت بناتا ہوں"

جگنا نے ہاتھ جوڑ کر ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ہجور (حضور) میں تو مہاراج سے اتنے کہوں رہا کہ مو کا بُکھار ہے بس یہی پر یہ رسیائے گیں اور مصریا کو مارن لاگین (میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ مجھے بخار ہے بس اتنی سی بات پر مہاراج خفا ہو گئے اور مصریا کو مارنے لگے)
مہاراج نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ "ابے جھوٹ کیوں بولتا ہے"

دیوان جی کو اپنا بدن دکھاتے ہوئے مصریا نے دبی زبان سے کہا "سرکار خود دیکھ لیں"

بڑے آدمیوں میں یہ ایک خاص صفت ہوتی ہے کہ جس بات کا وہ پہلے فیصلہ کر لیتے ہیں اس کے خلاف پھر کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ رام اوتار برہمن تھے مصریا اور جگنا چمار تھے ان کا مقابلہ ہی کیا تھا۔ ایک "شریف" برہمن کے سامنے نیچوں کی کون سنتا ہے۔ دیوان جی کے سامنے نیکی اور بدی میں جنگ ہو رہی تھی۔ ایک طرف فرض دوسری طرف غرض۔ ایک طرف محبت دوسری طرف انصاف۔ ایک طرف دنیا دوسری طرف دین کا خیال تھا۔ لیکن دیوان جی کا تو دل چھل۔ کپٹ۔ فریب ریاکاری سے سیاہ ہو چکا تھا۔ خود غرضی دولت اور ثروت نے ان کی آنکھوں پر پٹی اور کانوں میں روئی دیدی تھی ایسی حالت میں انسان سنتا ہے مگر نہیں سنتا دیکھتا ہے مگر نہیں دیکھتا۔ دیوان جی نے سوچا کہ اگر وہ چماروں کا ساتھ دیں گے تو جگ ہنسائی ہو گی مہاراج کا تمام علاقہ میں اثر ہے۔ وہ بڑی بدنامی کرائیں گے بالائی آمدنی کا ذریعہ جاتا رہے گا یہی سب کچھ سوچ کر انھوں نے قصداً انصاف کا خون کیا۔ انھوں نے اشاروں ہی اشاروں میں سمیا پاسی کو اپنا فیصلہ دیدیا —— اور بڈھے جگنا اور مصریا پر مار پڑنے لگی ان کی آہ و بکا سے "ضلع گونج اُٹھا" نرم دل اس جگہ سے ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ دوسروں کے بل پر اکڑنے والے سنگدل مونچھوں پر تاؤ دینے لگے "میکی" "سرکار کی دُہائی" دینے لگی ٹھیک اسی وقت باہر کچھ شور ہوا۔ "ڈپٹی صاحب آ گئے" سمیا نے ہاتھ روک لیا۔ لالہ جی اپنی دھوتی سنبھالتے ہوئے کھڑے ہو گئے مہاراج کے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔

جگنا ایک طرف زمین پر بیہوش پڑا تھا اس کے زیادہ چوٹ لگی تھی۔ مصریا طاقتور تھا اتنی مار کھانے پر بھی وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دیوان جی نے بڑے ادب سے جھک کر پہلے ڈپٹی صاحب کو اور پھر پیشکار صاحب کو سلام کیا۔ ڈپٹی صاحب کو تو خوف یا ڈر سے

لیکن پیشکار صاحب کو اپنا مددگار سمجھکر۔ آخر نہیں کے لئے تو یہ مفت کی بیگاری تھی کیا اب وہ دیوان جی کی مدد نہ کریں گے؟

ڈپٹی جانتی پرشاد بڑے نیک دل اور منصف مزاج تھے آج کل اس صفت کے حاکم مشکل سے ملتے ہیں لیکن اس زمانہ میں کوئی ہر ایک کو خوش نہیں رکھ سکتا چنانچہ جہاں ڈپٹی صاحب سے سارا علاقہ خوش تھا وہاں ایسے بھی لوگ تھے جو ان سے ناراض تھے ان کی منصف مزاجی سے پیشکار۔ اردلی۔ غرضکہ ان کا سارا عملہ نالاں رہتا تھا۔ پُرانے ڈپٹی صاحب کے زمانہ میں اہلکاروں کی چاندی تھی لیکن اب سوکھی تنخواہ میں ان کا مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔ ڈپٹی جانتی پرشاد کے سامنے امیر غریب سب برابر تھے شریف پرور ہوتے ہوئے غریب پرور بھی تھے۔ جگوا اور مصریا کے حال زار پر ان کو رحم آگیا ان کی تجربہ کار نظروں نے سب کچھ معلوم کرلیا ظالم اور مظلوم کی حالت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ حاکم پرگنہ کے قیام کے زمانہ میں بھی یہ اندھیر کھاتہ! ایسا ظلم! ان کے خواب وخیال میں بھی نہ آیا ہوگا۔ ڈپٹی صاحب نے دیوان جی سے مخاطب ہوکر پوچھا "کیا آپ ہی اس گاؤں کے کارندہ ہیں؟"

دیوان جی نے خوشامدانہ لہجہ میں جواب دیا "جی حضور"

ڈپٹی صاحب نے چماروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان غریبوں کی ایسی کونسی خطا تھی جسکی پاداش میں آپ کو قانون اپنے ہاتھ میں لینا پڑا"

اب تو دیوان جی کی گھگھی بندھ گئی گھبرا کر پیشکار صاحب کی طرف دیکھنے لگے ایک مرتبہ پہلے ہی جب دیوان جی نے کسی اسامی کو پٹوایا تھا تو اُس نے سابق ڈپٹی صاحب سے جاکر فریاد کی لیکن پیشکار صاحب کی عنایت سے دیوان جی کو تو کچھ نہ ہوا بلکہ الٹا اسامی ہی کو تین ماہ کے لئے جیل جانا پڑا تھا۔ لیکن آج خلاف معمول پیشکار صاحب کی آنکھوں سے بجائے ہمدردی کے نفرت کا اظہار ہورہا تھا دیوان جی کو "بسوہ کے بجائے بیگھہ" کاشت کو غیر کاشت "موروثی کو غیر موروثی" بنادینے کا خوب تجربہ تھا لیکن انھیں اس کا بالکل تجربہ نہیں تھا کہ اہلکار حاکم پرگنہ کے اشاروں پر ناچتے ہیں جس رنگ میں اپنے حاکم کو دیکھتے ہیں اسی میں وہ خود بھی رنگ جاتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب کی نگاہیں پھری دیکھکر بھلا پیشکار صاحب کچھ سفارش کرنے کی کیسے جرأت کر سکتے تھے۔

دیوان جی کو بحر خیال میں غوطے لگاتے دیکھکر ڈپٹی صاحب نے مکرر دریافت کیا تو دیوان جی نے کہا "حضور! ان چماروں نے میرے پیادے کی جو برہمن ہے بڑی بے عزتی کی ہے"

ڈپٹی صاحب نے مسکرا کر کہا "ان غریب چماروں نے؟"

ڈپٹی صاحب کو مسکراتے دیکھکر دیوان جی بھول گئے۔ بقول تلسی داس جی جس طرح سوکھے تال اور تلیاں برساتی۔ پانی پاکر آپے سے باہر ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح کمظرف آدمی بھی ذرا سی بات پر اترانے لگتا ہے۔ دیوان جی نے اپنے خاص منشیانہ لہجہ میں جواب دیا۔ "حضور آپ ان چماروں کو غریب نہ سمجھیں یہ بڑے موٹے اسامی ہیں ان کی سرکشی تو گاؤں بھر میں مشہور ہے۔ یہ آپ ہی لوگوں کا اقبال ہے کہ میں ان کو دبلائے رکھتا ہوں ورنہ یہ لوگ تو ہمارا گاؤں رہنا دشوار کردیں۔ حضور ابھی ان لوگوں سے واقف نہیں ہیں"

ڈپٹی صاحب کا لہجہ بدل گیا انھوں نے کہا "یہ سب کچھ سہی مگر آپ کو یہ کسی نے اختیار نہیں دیا کہ آپ ان لوگوں کو کوئی سزا دیں

اگر ان کے خلاف آپ کو کوئی شکایت تھی تو آپ قانونی کارروائی کر سکتے تھے آخر ہم لوگ کس واسطے ہیں" یہ کہکر ڈپٹی صاحب نے مصریا سے اس کا حال پوچھا وہ خوف بھری نظروں سے دیوان جی کی طرف دیکھنے لگا جس کا مطلب تھا "بتانے کو تو سب بتا دوں لیکن آپ کے جانے کے بعد میری جو گت بنے گی اس کا ذمہ دار کون ہوگا" ڈپٹی صاحب اس کا مطلب سمجھ گئے انھوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا "تم کچھ خوف نہ کرو اب دیوان جی تمہارا کچھ نہیں کر سکتے" لیکن مصریا اب بھی خاموش تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکتا تھا۔ آخر کار اس مشکل کو اس کی ماں میکی نے ڈپٹی صاحب کے سامنے آکر حل کر دیا۔ عورت کا دل نازک ہوتا ہے۔ جوان بیٹے اور بڈھے شوہر کی مصیبت کو دیکھکر وہ کیسے خاموش رہ سکتی تھی۔ جب کوئی اس کا ہمدرد نہ تھا تب تو وہ چپ نہ رہ سکی تھی اب ڈپٹی صاحب ایسے ہمدرد کو پاکر وہ اس موقع کو بھلا کیوں ہاتھ سے جانے دیتی۔ وہ روتی ہوئی ڈپٹی صاحب کے پاؤں پر گر پڑی——— "دہائی ہے سرکار کی۔!"

ڈپٹی صاحب جلدی سے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے اس خیال سے نہیں کہ میکی چمارن ہے بلکہ اس وجہ سے کہ خوشامد انصاف کا خون کر دیتی ہے۔

میکی نے رو رو کر ساری سرگزشت شروع سے لیکر اخیر تک سنا دی۔ اب انصاف کی باری آئی دیوان جی، مہاراج رام اوتار، سمیا پاسی کے بیانات قلمبند کئے گئے۔ منشی جمال الدین اور چودھری دو موقع کے گواہ بنائے گئے

ڈپٹی صاحب نے میکی سے کہا "تمہارے لڑکے اور شوہر کو ڈاکٹری معائنہ کے لئے مرزاپور جانا پڑے گا" میکی جوشِ انتقام میں پاگل ہو رہی تھی اس نے کہا "جو حکم ——"

۴

سول سرجن نے مصریا کو "ضرب خفیف" اور جگنا کو "ضرب شدید" کا سرٹیفکٹ دیا۔ اب پولیس کی کارروائی شروع ہوئی۔ داروغہ جی مع اپنے چند "نفر" کانسٹبلان کے "بھدین" میں رونق افروز ہوئے۔ مقلع پر سب کچھ موجود تھا۔ گھوڑے کے سامنے گھاس ڈال دی گئی۔ دودھ کے گھڑے آ گئے۔ خوانِ نعمت بچھ گیا تر لقمے اڑنے لگے جنھیں اپنے گھر میں سوکھی روٹی بھی مشکل سے ملتی تھی وہ پوری کچوری حلوہ وغیرہ کو دیکھکر ناک بھوں چڑھانے لگے۔ دماغ زمین سے آسمان پر پہنچا۔ ان سب "تکلفات" یا "حقوق" سے فراغت پاکر داروغہ جی نے تفتیش شروع کی۔ اڑوس پڑوس میں بھاگ دوڑ ہونے لگی کسی کو ڈرایا کسی کو دھمکایا۔ حاکم پرگنہ کے حکم سے اس مقدمہ کی بنیاد پڑی تھی ان کا خیمہ ڈیرہ بھی بھدین کے قریب لگا ہوا تھا اس وجہ سے داروغہ جی کو زیادہ پاؤں پھیلانے کا موقع نہ ملا پھر بھی انھوں نے اپنا کچھ بھلا کر ہی لیا شہادت کافی سے زیادہ بہم پہنچ گئی اور داروغہ جی نے اپنی تفتیش مکمل کر کے ڈپٹی جانکی پرشاد کے یہاں مہاراج رام اوتار، دیوان جی سالک رام اور سمیا پاسی کا اس جرم میں چالان کر دیا کہ ان لوگوں نے جگنا اور مصریا کو حبس بیجا میں رکھکر اذیت جسمانی پہنچائی۔ اس کی خبر بھدین کا تو ذکر کیا دور دور تک پہنچ گئی۔ کنور صاحب کو تو اپنے عیش و عشرت سے کام تھا۔ معاملہ مقدمہ سے ان کی روح فنا ہوتی تھی پھر بھی ضمانت دیکر ملزموں کو رہائی دلائی ایسا نہ کرتے تو ان کی بدنامی ہوتی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے ڈپٹی صاحب کے

پاس جاکر سفارش کرنے کی انہیں جرأت نہ ہوئی مرزا پور دا پس جاکر مقدمہ کی پیروی کرنے کے لئے انہوں نے ایک وکیل بھیجدیا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا۔ دیوان جی اور مہاراج نے وکیل صاحب کے سامنے رو رو کر کہا "وکیل صاحب! جس طرح بھی ہو ہماری عزت بچالو۔ روپیہ پیسہ کی کچھ فکر نہ کرنا ہم آپ کو خوش کر دیں گے"

وکیل صاحب مقدمہ کے حالات سے واقف ہو چکے تھے انھوں نے جواب دیا۔ "مقدمہ بہت سنگین ہے کامیابی کی بہت کم امید ہے"

یہ سنتے ہی مہاراج اور دیوان جی کے چہروں پر اداسی چھاگئی۔ دیوان جی نے اداس ہو کر کہا "تو کیا اب ہماری عزت کسی کسی طرح نہیں بچ سکتی؟"

وکیل صاحب نے کہا "بس ایک ترکیب رہ گئی ہے"

سوکھے دہانوں میں پانی پڑگیا سب نے ایک زبان ہو کر کہا "وہ کیا"

وکیل صاحب نے جواب دیا۔ "قانون سے تو تم لوگ کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ ہاں اگر جگنا ڈپٹی صاحب سے جاکر کہدے کہ اسکو تم لوگوں سے کوئی شکایت نہیں ہے تو بہت ممکن ہے کہ ڈپٹی صاحب مقدمہ خارج کر دیں" ترکیب تو اچھی ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ جگنا سے کون جاکر کہے اور کہے بھی تو کس منہ سے۔ مصریا اور جگنا کی بے عزتی کر کے کوئی ان سے سفارش کی کیسے درخواست کر سکتا تھا ایک بات اور تھی مہاراج اور دیوان جی چماروں کے سامنے جاکر کیا اپنا سر اٹھا سکتے تھے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وکیل صاحب کی رائے پر کوئی عمل کرنے کرنے لئے تیار نہ ہوا۔ دیوان جی کا اپنا "بھدین" میں کوئی نہ تھا جو ان کے غم میں شریک ہوتا۔ ایک دور کے رشتہ دار کو اپنے وطن غازی پور سے بلایا تھا لیکن انھوں نے بھی کورا جواب بھیج دیا تھا کہ "مجھے فرصت نہیں ہے" مہاراج کا گھر "بھدین" ہی میں تھا۔ "مہاراجن" کے سوا ان کا بھی اس دنیا میں کوئی اپنا ساتھی نہ تھا۔ سمیا پاسی کا کنبہ بڑا تھا لیکن اس کی بساط ہی کیا وہ تو دیوان جی اور مہاراج کے ہاتھوں میں کھلونا تھا۔ جب وکیل صاحب کے پاس سے مہاراج اپنے گھر پر پہنچے تو مہاراجن نے پوچھا۔

"سب کشل (خیریت) تو ہے"

مہاراج نے اداس ہو کر جو کچھ انھوں نے وکیل صاحب سے سنا تھا مہاراجن سے کہدیا۔

"مقدمہ کب ہوگا؟"

"کل سویرے ۱۰ بجے"

مہاراجن کا کلیجہ دھڑکنے لگا اس نے کہا۔ "میں میکی سے جاکر کہونگی وہ میری بات ضرور مان لیگی" "نہیں نہیں تم ان چماروں کے یہاں ہرگز نہ جانا میں یہ بے عزتی نہیں برداشت کر سکتا کہ تم چماروں کی خوشامد کرو اس سے تو مرجانا ہی اچھا ہے" مہاراجن چپ ہو گئیں مہاراج تھوڑی دیر کے بعد پھر گھر سے چلے گئے ان کے جانے کے بعد مہاراجن نے بھی گھر سے قدم باہر نکالا۔ دن ڈوب رہا تھا مویشی چراگاہ سے واپس ہو رہے تھے چھوٹے چھوٹے بچے جو دنیا کی فکروں سے آزاد ہیں کوئی مٹی کے گھروندے بنا کر کھیل رہا تھا اور کوئی

"گلی ڈنڈا" سے اپنا دل بہلا رہا تھا۔ مہاراجن نے جلدی جلدی اپنا قدم بڑھایا وہ میکی سے ملنے جا رہی تھیں پہلے تو انھوں نے یہی سوچا تھا کہ چماروں کی خوشامد کرنے سے تو مرجانا ہی اچھا ہے لیکن جب انھوں نے مہاراج کی آنے والی مصیبت کا خیال کیا تو انکا کلیجہ کانپ اُٹھا شوہر کی محبت میں وہ اس بے عزتی کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوگئی اور وہ بہت جلد میکی کے پاس پہنچ گئیں۔ جگنا اور مصریا تو کہیں باہر گئے ہوئے تھے میکی ہی اکیلی اپنے منڈیا میں بیٹھی ہوئی "گگنی" کا بھات بکا رہی تھی۔ مہاراجن کو دیکھکر اس کا دماغ عرش پر پہنچ گیا میکی کے دل میں خوشی کے جذبات اُٹھنے لگے۔ وہ سوچنے لگی "اوہو مہاراجن میری خوشامد کرنے آئی ہیں اب ان کا وہ غرور کدھر گیا کاش اس وقت مصریا اور اس کا باپ گھر پر ہوتا کاش تمام گاؤں والے آکر دیکھتے کہ مہاراجن ایک نیچ چمارن کے یہاں آئی ہیں" یہ پہلا انتقام تھا میکی نے اپنی طبیعت کو سنبھال کر کہا۔ "دھن ہے مہاراجن! گریبن (غریبوں) کی منڈیا میں تم کیسے آگئیں؟"

جملہ طعنہ آمیز تھا کوئی اور وقت ہوتا تو مہاراجن میکی کی خوب خبر لیتی لیکن آج بگڑنے کا موقع نہیں تھا۔ مہاراجن نے کہا "میکی ——"

میکی مہاراجن کی طرف غور سے دیکھنے لگی تھوڑی دیر تک مہاراجن چپ رہیں وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک طرف مہاراجن کی خودداری اور خاندانی وقار ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ ایک چمارن سے کوئی درخواست کریں لیکن دوسری طرف مہاراج کی عزت کا سوال تھا اگر ان کو سزا ہوگئی وہ قید ہوگئے تو کیا اس میں مہاراجن کی بے عزتی نہ ہوگی آخرکار مہاراجن نے رک رک کر کہا "میکی! میں آج تم سے بھیک مانگنے آئی ہوں" اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکیں۔ منھ ڈھانپ کر رونے لگیں۔

میکی کانپ اُٹھی۔ مہاراجن اور ایک نیچ چمارن سے بھیک مانگیں؟ میکی کے کانوں میں یہی صدا گونجنے لگی۔ "میں تم سے بھیک مانگنے آئی ہوں" میکی گنوار اور جاہل ہوتے ہوئے بھی اتنی بیوقوف نہ تھی کہ وہ مہاراجن کا مطلب نہ سمجھتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے سر پر انتقام کا بھوت سوار تھا لیکن مہاراجن کی حالت پر اسکو دیا آگئی۔ وہ عورت تھی عورت کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ مہاراجن کے درد آمیز جملہ نے اس کا دل پگھلا دیا اس کے سر پر سے انتقام کا بھوت اتر گیا۔ میکی کا تو یہی مقصد تھا کہ دشمنوں کا سر نیچا ہو دشمن خود اپنی زبان سے شکست کا اقرار کرے یہی سچی فتح ہے میکی نے کہا۔ "مہاراجن گسیاں (پرماتما) تمیں بنائے رکھیں ہم تمرے حکم سے باہر نہ ہوئیے (ہوں گے)۔"

مہاراجن کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں انھوں نے جوشِ محبت میں میکی کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ "ڈپٹی صاحب سے کہلا دو کہ وہ مقدمہ اُٹھالیں۔" یہ کہکر مہاراجن نے ایک پوٹلی جن کو وہ اپنے کپڑوں میں چھپائے ہوئی تھیں نکال کر میکی کے پاؤں پر رکھدی اس کے اندر کچھ روپیہ اور مہاراجن کے چاندی کے زیور تھے لیکن سخت اصرار کرنے پر بھی میکی نے لینے سے انکار کر دیا۔ آج مہاراجن کو بھی اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ شرافت کسی کا ورثہ نہیں یہ لعل بے بہا کبھی اونچے گھرانوں کے محلوں میں چمکتا ہے تو کبھی گھاس پھوس سے چھائی ہوئی جھونپڑیوں کو بھی روشن کرتا ہے۔

سکی کے اطمینان دلانے پر مہاراجن خوش خوش اپنے گھر واپس ہوئیں۔

۵

آج ڈپٹی جانتی پرشاد کی عدالت میں خاص رونق تھی وہ لوگ جو عدالت سے دور بھاگتے تھے انھوں نے بھی آج پرانے کپڑوں کو دھو دھلا کر زیب تن کیا۔ خوب سنبھال کر پگڑی باندھی اور عدالت میں پہنچ گئے جن کو اندر جگہ نہ ملی وہ باہر ہی کھڑے ہو کر مقدمہ کی کارروائی دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ تماشائی ٹوٹے پڑتے تھے۔ وقت مقررہ پر ڈپٹی صاحب تشریف لائے چاروں طرف خاموشی چھا گئی لوگ سانس لیتے تھے مگر رک رک کر کہ کہیں آواز نہ نکل جائے اور چپراسی عدالت سے باہر نکال دے۔ دیوان جی سالک رام۔ مہاراج ورام اوتار اور رمیا پاسی ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے تھے ملزموں کے اداس چہروں پر سب کی نگاہیں پڑ رہی تھیں مقدمہ کی کارروائی شروع ہی ہونے والی تھی کہ جگنا نے ہاتھ جوڑ کر ڈپٹی صاحب سے کہا "حجور ہمکا کچھ شکایت نہیں ہے مقدمہ اٹھا لیں" سب لوگوں نے حیرت سے جگنا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرہ سے خوف یا ڈر کے بجائے استقلال کا پتہ چلتا تھا۔ داروغہ جی غضب آلود نظروں سے جگنا کو گھورنے لگے ڈپٹی صاحب کو بھی اس کا یا پلٹ پر سخت تعجب معلوم ہوا ملزموں نے احسانمند نگاہوں سے جگنا کی طرف دیکھا۔ ان نگاہوں میں معذرت کا پیغام پوشیدہ تھا۔

ڈپٹی صاحب نے سوچا شاید جگنا کو رشوت دی گئی ہے یا اس پر کسی نے زور ڈالا ہے انھوں نے کہا "جگنا خوب سوچ سمجھ لے۔ تجھے کسی نے ڈرایا دھمکایا تو نہیں ہے اگر ایسی کوئی بات ہو تو صاف صاف بتا دے تجھے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

جگنا نے جواب دیا "حجور ہم پر کسی نے دباؤ نہیں ڈالا ہم خوشی سے چاہت (چاہتے ہیں) کہ آپ مقدمہ اٹھا لیں"

اب کچھ کہنا سننا فضول تھا۔ ڈپٹی صاحب انصاف پسند ہوتے ہوئے شریف پرور بھی تھے وہ صلح صفائی کی کارروائی میں کوئی اعتراض نہیں کرتے تھے انھوں نے سوچا کہ ملزموں کی کافی بے عزتی ہو چکی ہے جگنا اور مصریا کو گاؤں میں رہنا ہے "دریا میں رہ کر مگر سے بیر" بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے انھوں نے ملزموں سے مخاطب ہو کر کہا "دیکھو اب کبھی بیگار نہ لینا اسامیوں پر سختی نہ کرنا میل جول سے جو کام نکل جاتا ہے وہ ظلم سے کبھی نہیں نکل سکتا ہے۔ اپنی حماقت کا تم لوگوں کو کافی سبق مل چکا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب تم لوگ آئندہ احتیاط سے کام لو گے" یہ کہکر ڈپٹی صاحب نے مقدمہ خارج کر دیا۔ عدالت سے باہر نکل کر گاؤں والے دیوان جی اور مہاراج کو مبارکباد دینے لگے لیکن ان لوگوں نے بھیڑ سے نکل کر جگنا کو آواز دی "جگن بابا"

جگنا کو آج تک کسی نے "جگن بابا" کہکر نہیں پکارا تھا وہ فرط خوشی سے بیتاب ہو گیا اور دوڑ کر دیوان جی کا پاؤں چھو لیا۔ مصریا نے مہاراج کے قدموں پر سر جھکا دیا۔ اسوقت دیوان جی یا مہاراج کو اس بات کا خیال بالکل نہیں تھا کہ چماروں نے ان کے پاؤں کیوں چھوا اس وقت انکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے یہ آنسو خوشی کے تھے رنج یا حقارت کا ان میں کوئی نشان نہ تھا۔ اس وقت نیچ "اونچ" کا سوال نہ تھا یہ پریم ملاپ تھا۔ رمیا پاسی کے ساتھ ہی سب لوگ یکبارگی چلا اٹھے "جگن بابا کی جے"

اعظم کریوی

نقد الشعر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

تجنیس اس کے معنے متشابہ الفاظ کا استعمال کرنا ہے اس کی سات قسمیں ہیں:-
تجنیس تام۔ تجنیس ناقص۔ تجنیس زائد۔ تجنیس مرکب۔ تجنیس مزدوج۔ تجنیس مطرف۔ تجنیس خط۔

تجنیس کی تمام قسموں کا استعمال نظم اور نثر دونوں میں دلیل فصاحت ہے بشرطیکہ استعمال میں مذاق سلیم کو دخل ہو ورنہ یہی "حسن" عیب بن جاتا ہے۔

مذاق سلیم کے دخل کے یہ معنے ہیں کہ اسکا استعمال اس طرح نہ ہو کہ اس میں زیادتی اور تعدد نامناسب ہو۔ اس میں تناسب کا خیال اچھا ہے۔ ایک شعر میں دو سے چار الفاظ تک اہل نظر کے نزدیک "حسن" ہے

تجنیس تام۔ اسکی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک جگہ دو کلمے متفق اللفظ اور مختلف المعنے اس طرح استعمال کیے جائیں، جیسا خاقانی کہتا ہے:-

مفخر خاقانیست مدح تو تا در جہاں
صبح بزد آب ماہ میوہ برد ماہ آب

ایک اور شاعر کہتا ہے:-

اے چراغ ہمہ بتانِ ختا — دور بودن ز روی تست خطا

تجنیس ناقص اس میں ایسے کلمات متجانس ہوتے ہیں کہ حروف متفق لیکن حرکات مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً قطران کا شعر ہے:-

پیادہ شود دشمن از اسپِ دولت — چو باشی بر اسپِ سعادت سَوار
براسپ سعادت سواری وداری — بدست اندروں از سعادت سوار

پہلے شعر میں سوار (فتح سین سے) ہے جس کے معنے مشہور راکب کے ہیں۔ دوسرے شعر میں سوار (کسر سین سے) ہے جس کے معنے کنگن کے ہیں۔ تجنیس زائد۔ یہ ہے کہ ایک کلمۂ متجانس دوسرے سے بمقدار ایک حرف زیادہ ہو مثلاً:-

در حسرت رخسارِ تو اے زیبا روے
از نالہ چو نال گشتم از مویہ موے

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں نالہ اور نال مویہ اور موے میں تجنیس زائد ہے۔

تجنیس مرکب۔ اسمیں الفاظ متجانس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک کلمہ مفرد ہوتا ہے اور دوسرا دو کلمہ سے مرکب ہوتا ہے مثلاً:-

سرو بالاے کہ دارد بر سرِ سرو آفتاب ٭
آفتِ دلہاست و ندر دیدگاں زاں آفت آب

دوسرا شعر دیکھئے :-

درراہ تو تا زندہ ام　　　　بربوے تو تا زندہ ام

اس شعر کے پہلے مصرع میں تا زندہ مرکب ہے تا اور زندہ سے یعنی جب تک میں زندہ ہوں۔ دوسرے مصرع میں تازندہ مفرد ہے جس کے معنے دوڑنے والے کے ہیں۔ اس میں تا اور زندہ اور تازندہ میں تجنیس مرکب ہے۔

تجنیس مزدوج اس تجنیس میں کلمات متجانس ایک دوسرے کے مترادف ہوتے ہیں۔ معزی کے اشعار ہیں۔

ہست شکر بار یاقوتِ تو اے عیار یار　　　　نیست کس را نیز ز آں یاقوت شکر بار بار

سال تا سر جو گلزار است خرم عارضت　　　　چون دل من صد دل اندر عشق آں گلزار زار

نیمۂ دینار ماند آں دہانِ تنگ تو　　　　در دلِ تنگم فگند آں نیمۂ دینار نار

کبھی اس کی صورت تواتر کی ہوتی ہے اس کی مثال یہ ہے :-

افتاد مرا با دل مکار تو کار

وافگند دریں دلم دو گلنار تو نار

معزی کہتا ہے :-

اے گوے زنخ سخن زگویت گویم　　　　وے موئے میاں زعشق کے مویت مویم

کبھی تکرار کی صورت اس طرح ہوتی ہے :- رشید کہتا ہے۔

زہے مخالفتِ امر تو خطا و خطا　　　　زہے موافقتِ رائے تو صواب صواب

ایک اور شعر اسی صفت میں ہے :-

جہاں از دولت سلطانِ اعظم

بہار اندر بہار اندر بہار ست

تکرار کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ لفظاً تکرار ہو لیکن باعتبار معنے کے اس میں خوبی سمجھی جائے مثلاً :-

پیش شمال، روبیت پائے شمال در گل

پیش سحاب دستت، دست سحاب بر ہم

ایک صورت تکرار متکلف کی ہوتی ہے، عسجدی کہتا ہے :-

باران قطرہ قطرہ ہمی بارم ابروار　　　　ہر روز خیرہ خیرہ ازیں چشم سیل بار

زان قطرہ قطرہ قطرۂ باراں شدہ خجل

زان خیرہ خیرہ خیرہ دل وجان من فگار

تجنیس مطرف۔ اس میں دو کلمہ متجانس تمام حروف میں سوا حرفِ طرف کے باہم متفق ہوتے ہیں۔ حرف طرف آخر حرف کو کہتے ہیں مثلاً:۔

از شرار تیغ بودے بادساداں را شراب
در طعان رمح بودے خاکساراں را طعام

جب دونوں کلمے متقارب ہوں تو اس کا نام "اشتقاق" ہوگا۔ مثلاً

نوائے تو اے خوب چہر نوائیں		در آورد در کار من بے نوای

تجنیس خط۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ الفاظ صورت میں بظاہر ایک معلوم ہوتے ہیں لیکن معنے میں فرق ہوتا ہے مثلاً:۔

ہماں خوشتر کہ نوشی اندریں مدت مئے صافی
ہماں بہتر کہ پوشی اندریں موسم خز ادکدہ

نوشی اور پوشی لفظاً اگر ن اور پ پر نقطے نہ دیجئے تو ایک معلوم ہوں گے نقطے دینے سے صورت ایک رہتی ہے صرف خط و خال میں فرق معلوم ہوتا ہے لیکن معناً دونوں باہم بالکل مختلف ہیں۔

مطابقت بحث میں کسی چیز کا مقابلہ کسی ایسی چیز کے ساتھ جو اس کے مثل ہو، اصطلاح میں متضاد اشیا کو ایک سلسلے میں لانے کا نام ہے نظیری کا ایک شعر دیکھئے اس میں آٹھ چیزیں یکجا کی ہیں:۔

بزم و رزمش در دو خارہ عفو و خشمش نور و نار
امن و بیمش تخت و دار و مہر و کینش فخر و عار

دو شعر کسی کے اس صفت میں بہترین یہ ہیں:۔

غم با لطفِ تو شادمانی گردد		عمر از نظر تو جاودانی گردد
گر باد بدوزخ برد از کوی تو خاک		آتش ہمہ آب زندگانی گردد

تشبیہ ایک چیز کو دوسری چیز کے مشابہ کرنے کو کہتے ہیں، دونوں مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان کسی مشترک شے کا ہونا ضروری ہے ارباب فن کے نزدیک کامل تر اور بہترین تشبیہ وہ ہے کہ اگر چاہیں تو مشبہ اور مشبہ بہ کو باہم تشبیہ دے سکیں مثلاً زلف کو رات کہہ سکتے ہیں۔ اور رات کو زلف۔

ناقص تشبیہ کی بنیاد صرف وہم و خیال پر ہوتی ہے خارج میں اس کی مثال نہیں ہوتی۔
شلاً کوئی شخص متورہ آتش کو مشک سے بھرے ہوئے دریا سے تشبیہ دے، ارزقی نے اس قسم کی تشبیہات سے اپنے اشعار کو اکثر ناپاک کیا ہے۔

آج کل نئی فارسی کے نئے شاعر، نئی روشنی کے اردو شاعر اس قسم کے تماشے اکثر کرتے ہیں اور تماشہ بینوں سے داد لیتے ہیں۔

تشبیہ کی حسب ذیل قسمیں ہیں :-

تشبیہ صریح ۔ تشبیہ کنایہ ۔ تشبیہ مشروط ۔ تشبیہ معکوس ۔ تشبیہ مضمر ۔ تشبیہ تسویت ۔ تشبیہ تفضیل

تشبیہ صریح ۔ اس میں الفاظ تشبیہ ہمچناں ، بداں ، می ماند وغیرہ مذکور ہوتے ہیں مثلاً ازرقی کہتا ہے :-

پیچیدہ ل افعی بکمندت ماند   . . . .
اندیشہ برفتن سمندت ماند   خورشید بہ ہمت بلندت ماند

تشبیہ کنایہ ۔ وہ ہے کہ حروف تشبیہ سے خالی ہو مثلاً عنصری کا یہ شعر :-

گاہ برماہ دو ہفتہ گرد مشک آری بدید
گاہ مرخورشید را در غالیہ پنہاں کنی

تشبیہ مشروط ۔ وہ ہے جس میں حرف شرط مذکور ہو مثلاً :-

اگر مورے سخن گوید وگر موے رواں دارد
من آں مور سخن گویم من آں مویم کہ جاں دارد

تشبیہ معکوس ۔ وہ ہے جس میں ایک شے دوسری شے سے تشبیہ دی جاتی ہے ، پھر مشبہ بہ کو پہلے سے تشبیہ دیتے ہیں ۔ مثلاً عنصری کہتا ہے :-

ز سم ستوران و گرد سپاہ   زمین ماہ روی و زمین روے ماہ

زمین کے چہرے کو گھوڑوں کے نعل کے نشاں کی وجہ سے چاند سے تشبیہ دی ہے اس کے بعد چاند کو کثرت غبار سے زمین کہدیا ہے ۔

تشبیہ مضمر ۔ وہ ہے کہ شاعر کسی وصف میں تشبیہ کو مضمر رکھتا ہے اور اس معنے سے اس کی مراد وہی تشبیہ ہوتی ہے مثلاً :-

گر انگبیں لبی سخن تو چرا است تلخ
ور یاسمیں بری تو بدل چونکہ آہنی

اس جگہ شاعر شہد سے معشوق کے لب کو تشبیہ دیتا ہے اور آغوش کو یاسمین سے

(باقی)

کیفی چریاکوٹی

بھاگلپوری ٹسری ریشمی صافے

ٹسری اور ریشمی صافے یا تھان برائے کوٹ ، قمیص ، شیروانی اعلیٰ درجے کے درکار ہیں تو ہمارے یہاں سے منگا کر استعمال میں لائے

ملنے کا پتہ   **مولوی کبیر احمد خاں برادرز بھاگلپور سٹی**

ڈرامے کا ایک سین

نمبر ۱

شاہنواز بانی سلطنت جمہوری کا جہاز بندرگاہ دمشق پر کنارے کے قریب پہونچتا ہے کہ اتفاقاً اُس میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس خوفناک منظر کو یعقوب ملک التجار کنارہ سے دیکھتا ہے اور اپنی کشتی مصیبت زدہ مسافروں کی امداد کو روانہ کرتا ہے اتفاق سے صرف ایک ہی شخص یعنی شاہنواز یعقوب کے مددگاروں کے ذریعہ سے زندہ کنارہ پر پہونچتا ہے اور باقی سب طعمۂ اجل ہوجاتے ہیں۔

نمبر ۲

زبیدہ یعقوب کی حسین لڑکی حالت بیماری میں شاہنواز کی تیمار دار ہوتی ہے، ایک طویل زمانہ کی یکجائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پری جمال زبیدہ نوجوان شاہنواز کو دل دے بیٹھتی ہے لیکن خلاف اُمید شاہنواز اس کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ تلوار کا عاشق عورت کی محبت کو حقارت سے دیکھتا ہے، اب وہ وقت ہے کہ شاہنواز اپنے محسن سوداگر یعقوب سے رخصت طلب کرتا ہے اور اپنی نو آبادی کا ارادہ کرتا ہے رخصت مل جانے پر ایک آخری اُمید زبیدہ کو پیدا ہوتی ہے اور ایک رقعہ کے ذریعہ سے شاہنواز کو اپنے باغ میں بلواتی ہے۔

نمبر ۳

حسب قرار داد زبیدہ آدھی رات گزر جانے کے بعد مقام مقررہ پر شاہنواز کا انتظار کر رہی ہے۔

زبیدہ (آپ ہی آپ) مہیب رات۔ خوفناک وقت۔ وحشت انگیز رات نے
اپنی زلف دراز کا سایہ مخلوقات عالم پر پھیلا دیا ذیحیات ہستیاں محوخواب ہیں

شب تاریک نے ڈالے ہیں ڈیرے آسمانوں میں چھپے ہیں خوف ظلمت سے پرندے آشیانوں میں
ہوا کی سنسناہٹ تیر بن جاتی ہے کانوں میں جگاتے ہیں بخس خو کو جادوگر مسانوں میں

ہوا پر اڑ کے ٹکڑے ابر کے طوفان لائے ہیں
کہاں پر کھینچ کر مجھکو مرے ارمان لائے ہیں

وہ ابھی تک نہیں آیا۔ آئیگا ضرور آئیگا اور دنیا کے اسٹیج سے یہ سیاہ پردہ اُٹھنے سے پہلے میری قسمت کا فیصلہ ہو جائیگا۔

شاہنواز ایک سیاہ جبہ میں داخل ہوتا ہے

زبیدہ ۔ دھوئیں کی طرح شب تاریک میں صنف نازک کی طرف بڑھنے والے سایہ (خفیہ لفظ)

شاہنواز ۔ پریسڈنٹ سلطنت جمہوری

زبیدہ ۔ اوہ مجھے انتظار کی تکلیف دیر تک اٹھانا نہیں پڑی اس لئے میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں ۔ پیارے شاہنواز!

شاہنواز۔ (بات کاٹ کر) ٹھہرو۔ تم نے کیا کہا "پیارے شاہنواز" بیگم اس بیباکی کے کیا معنے جو لفظ عشق کی دنیا میں استعمال کیا جاتا ہے وہ ایک سپاہی کو مخاطب کرنے کے لئے موزوں نہیں اور پھر میری معمولی خدمت کسی غیر معمولی شکریہ کی سزاوار نہیں۔

بیگم۔ (خود بخود) کیا دلشکن لہجہ کیسا تلخ جواب! اچھا بہادر نبرد آزما صاحب! مجھے اس قدر تو مایوس نہ کیجیئے کہ اظہار مدعا کے الفاظ تلخ ہوکر میرے ہونٹوں سے نفرت کرنے لگیں۔

شاہنواز۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس مشتبہ ملاقات کو جلد سے جلد ختم کردیں گے۔

بیگم۔ کیا بیوفایانہ برتاؤ اور کیسا بیمروتانہ طرز عمل ہنو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے میں کہونگی اور تمہیں سننا پڑے گا

شاہنواز۔ اچھا یہ بھی سہی اگرچہ میں نے عورتوں کے حکم کی تعمیل آج سے پہلے کبھی نہیں کی۔

بیگم۔ شاید تمھارے دلمیں اس ودیعت کی قدر نہیں جس کو تعلیم یافتہ انسان محبت کہتے ہیں۔

شاہنواز۔ (تبسم آمیز لہجہ میں) میں سپاہی ہوں اور سپاہی کو محبت کی دلفریبی کا حس نہیں ہوتا۔ ہاں تو آپ اس غرض خاص کو بیان کرنے میں ذرا جلدی کریں جسکے سننے کیلئے میں بلایا گیا ہوں۔

زبیدہ (خود سے) ناامیدی، مایوسی، عجیب شخص! غالباً تم ابتک یہی نہیں جانتے کہ عشق کیا چیز ہے

شاہنواز۔ بس اتنا ہے کہ انسانوں کے ہر طبقہ میں ایک مجنونانہ حرکت کا نام عشق ہے

زبیدہ۔ پیارے شاہنواز۔ اے توبہ معاف کرنا خدا بُرا کرے جذبۂ بے اختیار شوق کا جس نے مجھے دوبارہ گنہگار بنا دیا شاید ابھی آپ نے حکم دیا تھا کہ میں پیارے کا لفظ آپ کے لئے استعمال نہ کروں۔

شاہنواز۔ بالکل صحیح ہے کیونکہ ایک سپاہی کو مخاطب کرنے کے لئے اس نسوانیت اثر لفظ میں کوئی شان پیدا نہیں ہوتی۔

زبیدہ۔ تم جاہل ہو

شاہنواز۔ اس کا مجھے فخر سے اعتراف ہے کیونکہ بہادر اور جاہل قریب قریب ہم معنی الفاظ ہیں۔

زبیدہ تم نے عشق کی تعریف کرنے میں غلطی کی

شاہنواز۔ یہ بھی ممکن ہے۔ اب آپ عشق کی صحیح تعریف بیان کردیں

زبیدہ۔ سنو عشق اک الہامی طاقت ہے وہ اپنے سحر آفریں کرشموں سے عقل کی طاقت پر غالب آتا ہے اور ہر جگہ نئی صورت اختیار کرتا ہے

کہیں وہ نور بنتا ہے کہیں وہ نار بنتا ہے
کہیں وہ پھول بنتا ہے کہیں وہ خار بنتا ہے
کبھی وہ دلشکن بنتا ہے گہہ دلدار بنتا ہے
کہیں وہ وارد‌ی صحت اور کہیں آزار بنتا ہے

کہیں پورا مسیحا ہے کہیں بیدرد قاتل ہے
کہیں جاگی ہوئی قسمت کہیں ٹوٹا ہوا دل ہے

شاہنواز۔ اخاہ یہ تین حرف کا لفظ اور جذبات انسانی کا مجموعہ خیر بیگم اگر یہ عشق کی سچی تعریف ہے تو ہوگی

بس اس کی طالبان عشق کو آرام آئیگا
مجھے کیا عشق سے مطلب مرے کس کام آئیگا

زبیدہ۔ کیا تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی

شاہنواز۔ کی ہے اور اب بھی کرتا ہوں

زبیدہ۔ کس سے

شاہنواز۔ تبر سے، تلوار سے، خنجر سے اور پیکاں سے
خوں بھری شمشیر سے، لاشوں بھرے میدان سے
فوج کی موجوں سے بحر موت کے طوفان سے
خون کے سیلاب سے اور زخم کے ارمان سے

ہوتا ہی ہر ہر قدم پر انقلاب زندگی   زیست کا وقفہ سپاہی کو ہی خواب زندگی

زبیدہ ۔ نبرد آزما نوجوان انہیں شجاعت کے قصوں نے انہیں جوانمردی کے داستانوں نے ایک عورت پر بھی وار کیا ہے ۔

یہی قصے ہیں آمادہ دل آزاری پر   جو سنائے ہیں مجھے بستر بیماری پر
دوست دشمن کو بہرکیف دغا سے مارا   تیرے اسکو مجھے تیر ادا سے مارا

شاہنواز ۔ بیگم اب ہماری آپ کی ملاقات ختم ہونا چاہیے

زبیدہ ۔ نہیں شاہنواز نہیں بشنو کہدو کہ زبیدہ میں تجھے چاہتا ہوں

شاہنواز ۔ تم غلط فہمی میں مبتلا ہو جذبات جوانی تمہیں دہوکا دے رہے ہیں اور تم اپنی عالم فریب حسن کو ایک سپاہی کی تلوار پر قربانی چڑھا رہی ہو ۔ سوچو ۔ سمجھو ۔ اور غور کرو ۔

میں سپاہی ہوں مجھے حسن و ادا سے کیا غرض
بیوفا سے کیا تعلق باوفا سے کیا غرض
اک دل وحشی کو طرز دلربا سے کیا غرض
گیسو خمدار و چشم فتنہ زا سے کیا غرض
عشق بے ہنگام کا انجام بدنامی نہ ہو
ڈز ڈیمونا کی طرح آخر میں ناکامی نہ ہو

زبیدہ ۔ اف ری بیدردی ایک جائز وفا شعار بی بی بننے کیلئے میرے غرور نے تمہارے آگے سر جھکایا مگر تم نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا ۔

ملایا خاک میں تم نے مرے جذبات پنہاں کو ۔
جلایا دل کو سینہ کو جگر کو جسم کو جاں کو
جفا کے نشتروں سے بیوفا مجروح کر ڈالا
محبت کو وفا کو شوق کو حسرت کو ارماں کو

شاہنواز ۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ آپ دلفریب شاعری کو بیمحل استعمال کر رہے ہیں ۔ اگر کسی حسن پرست شاہزادے کے سامنے آپ اپنی فصاحت و بلاغت سے اظہار مدعا کرتیں

تو وہ قدر محبت اس قدر تو کم سے کم کرتا
کہ اپنے تاج والے سر کو ان قدموں پہ خم کرتا
یہ مانا آپ بہتر حسن میں ہیں سب زمانے سے
مگر کیا فائدہ اندھے کو آئینہ دکھانے سے

زبیدہ ۔ شاہنواز بہت زیادہ میرے حسن کی توہین اور میرے درخواست کی تحقیر ہو رہی ہے کیا تم پر کچھ اثر نہیں ہوتا ۔

شاہنواز ۔ ہاں میرے دل کو میدان جنگ کے خونی نظاروں نے پتھر بنا دیا اسمیں قبول محبت و عشق کی قابلیت نہیں رہی

رہے جنگل میں جو وہ کیا کریگا قدر باغوں کی
کھلی رہتی ہیں کلیاں سامنے زخموں کی غنچوں کی
جلاؤ شمع حسن اس میں کہ جس گھر میں اندھیرا ہو
کہیں بھی چاندنی میں قدر ہوتی ہے چراغوں کی

زبیدہ ۔ یہ بیدردانہ جواب ہے

شاہنواز ۔ اپنے فائدہ کے لئے آپ کی مرضی کے خلاف جواب دینا کوئی بیوفائی نہیں ۔

زبیدہ ۔ سن او غدار گرسم وفا سن جب تو بستر بیماری پر لاش کی طرح بیحس و حرکت پڑا ہوا تھا اور آتش زدہ جہاز کے زخموں کی تکلیف سے آخری سانس کا انتظار کر رہا تھا اوسوقت او بیمروت اسوقت میں نے تیرے بدبودار زخموں کو اپنے ہاتھوں سے دھو دھو کر مرہم لگایا ہے کیا اتنی جلد بھول گیا ۔

سہارا میرا جسم نازنین تھا راہ چلنے میں
مدد دیتے تھے میرے ہاتھ کروٹ کے بدلنے میں
بہت کم وقت باقی رہ گیا تھا دم نکلنے میں ۔
نہ تھا ہاتو نہ کچھ قابو کف افسوس ملنے میں

زرا سن وہ بھی تو اک وقت تھا بیدادگر تیرا
مرے ہاتھوں میں تیرے ہاتھ تھے زانو پہ سر تیرا

شاہنواز - اخاہ تو میری تیمارداری بھی ہمدردی انسانی نہ تھی آہیں
اک خود غرضی کا راز تھا -

اب وہ خود غرضی نمایاں بن کے رسوائی ہوئی
کرتی ہے عرض ندامت آنکھ شرمائی ہوئی
مارنے کے واسطے زندہ کیا تو کیا کیا
قتل کرنے کو جلایا کیا مسیحائی ہوئی

زبیدہ - افسوس میں کیا جانتی تھی کہ اپنے باپ کی تعمیل حکم کر کے اتنی ذلتیں اوٹھانا پڑیں گی -

شاہنواز - ہاں ہاں تم اکیلی اس معاملہ میں قابل ملامت نہیں تمہارا باپ بھی ہے -

زبیدہ - احسان فراموش میرے باپ نے کیا قابل ملامت کام کیا -

شاہنواز - اُس نے جوانی کے نشہ میں بدمست لڑکی کو ایک اجنبی جوان کی آغوش میں ڈھکیل دیا اس سے زیادہ غلطی کیا ہو سکتی ہے

رکھدیا کیوں دانۂ بارود انگارے کے پاس
آگ کو رکھتے نہیں عاقل کبھی پارے کے پاس
عمر بھر پچھتائے گا اس طرح کا ناداں طبیب
جس نے بٹھلایا ہو مستسقی کو فوارہ کے پاس

زبیدہ - تو اس سے کیا ہوا -

شاہنواز - اس سے یہ ہوا کہ محبت و عشق کے طوفانی موجوں نے قلعۂ عصمت کی بنیاد کو جڑ سے ہلا دیا اور اگر میں چاہتا تو اسیوقت تمہاری دامن عصمت کی دھجیاں کر کے ہوا میں اُڑا دیتا -

زبیدہ - زبردستی بغیر رضامندی -

شاہنواز - اوہ عورت کی رضامندی کو کتنی دیر لگتی ہے ناپاک بوسہ کی ایک چنگاری دامن عصمت کے ساتھ وہ سلوک کرتی ہے جو ایک چنگاری تمام خرمن کے ساتھ -

تجھ میں جذبہ مجھ میں طاقت تجھ میں خواہش مجھ میں جوش
مرد اگر چاہے تو عورت دم میں ہو عصمت فروش
عشق کی طاقت سے کوئی آج تک جیتا نہیں
میں کوئی یوسف نہیں ہوں تو کوئی سیتا نہیں

زبیدہ - اچھا شاہنواز خدا حافظ - مگر ہاں کیا میں یہ اُمید کروں کہ آج کی رات کے واقعات تم بھول جاؤ گی -

شاہنواز - بانو اطمینان رکھو یہ راز مرتے دم تک میرے سینہ میں دفن رہیگا -

(دونوں اپنی اپنی طرف جاتے ہیں)

شاہنواز - (زبیدہ کو روک کر) خاتون معظمہ ذرا صبر کیجئے آپ نے اپنے احسان کی یاد دلاکر میرے دل پر نشتر لگایا ہے اس لئے میں گھٹنے ٹیک کر معافی کا خواستگار ہوں کہ اپنی ذات کو محفوظ رکھنے کے لئے میں نے اگر گستاخانہ مقابلہ کیا ہو تو آپ اسے معاف فرمائیں گی -

(گھٹنے تک جھکتا ہے اور زبیدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بوسہ لیتا ہے یعقوب جو آڑے سے دیکھ رہا ہے اس کو بدگمانی ہوتی ہے کہ شاہنواز میری لڑکی کو بہکا رہا ہے وہ مغلوب الغضب بڑھا غصہ میں بھرا ہوا داخل ہو کر شاہنواز کو گردن سے پکڑتا ہے)

یعقوب - شیطان وبائی کیڑوں کی طرح شریف انسانوں کے خون میں زہر پھیلانے والے سیاہ کار قزاقوں کی طرح گناہ نیم شبی کے مرتکب ہوتا احسان فراموش یہ سب کیا تھا اور میری آنکھوں نے کیا دیکھا -

زبیدہ - اباجان

یعقوب - خاموش بدچلن لڑکی خاموش -

زبیدہ۔ حضور

یعقوب۔ ایک لفظ نہیں

شاہنواز۔ میرے محسن آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے خوفناک غلط فہمی

یعقوب۔ روز روشن میں طلوع آفتاب سے انکار کرکے تو اپنی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔

شاہنواز۔ جناب غصہ کرنے سے پہلے معاملہ سمجھنے کی ضرورت ہے

یعقوب۔ بس کتے میرے مکان کی در و دیوار کو ہوس پرستی کی ناپاک سانسوں سے دوزخ بنانے والا کیا تو نہیں۔ ایک فرشتہ خصلت لڑکی کی عصمت کو گندے عشق کے جذبات سے مجروح کرنے والا کیا تو نہیں۔

شاہنواز۔ ذرا مجھے چھوڑئے مجھے واقعات صحیح بیان کرنیکا موقع دیجئے

یعقوب۔ کبھی نہیں ترا گلا ترا گریبان میرے ہاتھ سے اس وقت تک نہیں چھوٹ سکتا جب تک تو لاش ہوکر میرے قدموں پر نہ گر پڑے۔

شاہنواز۔ (ہاہا ہاہا) دھوکا، میرے محسن غلط فہمی، وہم، شک بدگمانی،

شاہنواز۔ ہنستا ہے بے غیرت شرم کر۔

شاہنواز۔ میں ہنستا ہوں اور اس لئے ہنستا ہوں کہ ایک کمزور بوڑھا جسکو موت طفل شیرخوار کی طرح گود میں لئے پھرتی ہے ایک مشہور بہادر نبرد آزما کو کتے کی طرح جھنجوڑیاں دے رہا ہے اور وہ پاس احسان سے کچھ نہیں کہتا۔

یعقوب۔ کہہ اگر تیری زبان میں شریفانہ جنبش اور تیرے ضمیر میں اخلاقی طاقت ہے تو کہہ۔

شاہنواز۔ بس اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے مجھے جلتے ہوئے جہاز اور اُبلتے ہوئے سمندر سے نکال کر زندگی کے محفوظ کنارہ پر پہونچایا ہے اس لئے میرا شریف دل اجازت نہیں دیتا کہ اس بزدل گستاخی کا انتقام لوں۔

کیا کروں میں ہاتھ محسن پر اُٹھا سکتا نہیں
گالیاں سنتا ہوں لیکن سر اٹھا سکتا نہیں
شرم سے خون شرافت کا رگوں میں جوش ہے
دل بہت بے چین ہے لیکن زباں خاموش ہے

یعقوب۔ مکر پیشہ، روباہ خصال، تو خوشامد سے مجھے خوش نہیں کر سکتا۔

شاہنواز۔ بس بہت ہو چکا ایک سپاہی کے سینہ میں مغرور دل ہوتا ہے زیادہ سخت گیری مجھے گنہگار نہ بنا دے میں التجا کرتا ہوں کہ میرا گریبان چھوڑ دیجئے بس چھوڑ دیجئے۔

یعقوب۔ دھمکی، احسان کے بندے، مہربانی کے محتاج میرے رحم پر جینے والے۔ میں ان دھمکیوں کی پروا نہیں کرتا۔

شاہنواز۔ آخری التجا ہے کہ تم ہوش میں آجاؤ ورنہ مجھے سزا دینے کی ضرورت پڑے گی۔

ایک مشت استخواں کا نعرۂ پر شور کیا
تم ہو کیا اور یہ تمہاری ہستی کمزور کیا
دل نہ روکے گر غضب کی آندھیاں چلتی ہوئی
کاٹ ڈالوں تیغ سے منہ میں زباں چلتی ہوئی

یعقوب۔ محسن کش احسان فراموش کیا یہی ترا فرض تھا۔

شاہنواز۔ صاحب میں اپنا فرض نہیں بھولا۔ مگر آپ نے اپنا فرض بھلا دیا۔

یعقوب۔ میں نے اپنا فرض بھلا دیا وہ کیونکر۔

شاہنواز۔ وہ یہ کہ آپ کا فرض تھا کہ اپنی جوان لڑکی کو ایک نوجوان کی صحبت سے بچاتے مگر ایسا نہیں ہوا

کیوں نہ اس احمق کو ہوں رنج و بلا کے سامنے
شمع روشن کر کے جو رکھدے ہوا کے سامنے

باپ بیٹی کی حفاظت کرنے والا چاہیئے
جس خزانہ میں ہو دولت اسمیں تالا چاہیئے

یعقوب کیا تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ تو نے میری غلطی سے فائدہ اُٹھایا۔

شاہنواز۔ یہ دوسری غلطی ہے

یعقوب۔ یعنے

شاہنواز۔ یعنی میں بیگناہ ہوں خدا اور اس کے فرشتے انسان حیوان، نباتات، جمادات، ــــــــ حشرات ملکہ صحن عالم کا ایک ایک ذرہ شہادت دیگا کہ شاہنواز کا دامن ہوس پرستی کی نجاست سے پاک ہے۔

خوف کیا دنیا اگر ہو دشمنِ جانی مری
صورت یوسف ہے ثابت پاکدامانی مری

یعقوب۔ گناہ پر گناہ ناپاک گناہ شرمناک گناہ میری رسوائی کے زندہ اشتہار تو اس گھر کی چار دیوار کے باہر نہیں جا سکتا۔ میں تیرے منہ پر موت کا قفل لگاؤنگا۔

شاہنواز۔ کس کی مجال ہے

یعقوب۔ زبان دراز لے اور قیامت تک کے لیئے خاموش ہو جا۔ (ریوالور چلاتا ہے ریوالور پھٹ جانے سے گولی پھیپا کرتی ہے یعقوب مردہ ہو کر گرتا ہے)

شاہنواز۔ (لاش کو غور سے دیکھکر) مر گیا۔

زبیدہ۔ کس نے مارا۔

شاہنواز۔ انصاف و قدرت کے زبردست ہاتھ نے

زبیدہ۔ شاہنواز قسمت نے راستے کی ٹھوکر دور کر دی کیا تم اب اپنا خیال بدل دوگے۔

شاہنواز۔ بیحیا عورت آخر یہ تیرا باپ تھا۔

زبیدہ۔ مگر ایسا باپ جو اولاد کی ارمانوں کا خون کرنے والا۔

شاہنواز۔ صدمۂ مرگ پدر اذیو فا کچھ بھی نہیں

دل میں رحم اور آنکھ میں شرم و حیا کچھ بھی نہیں
ناخلف اولاد تو ہے باپ کے مرنے سے خوش
تجھ سے اب دنیا کو اُمید وفا کچھ بھی نہیں

زبیدہ۔ وہ تمھارا دشمن تھا اسلیئے میں اسکی دشمن تھی۔ کہو اب کیا جواب دیتے

شاہنواز۔ جواب صاف

زبیدہ۔ او نا انصاف عورت کی فطرت جتنی بھولی ہوتی ہے مکاری میں اتنی ہی بیباک بھی ہوتی ہے۔

شاہنواز۔ اس دھمکی سے کیا مطلب ہے

زبیدہ۔ مطلب مطلب یہ کہ میرے باپ کو قتل کر کے تو زندہ نہیں بچ سکتا۔

شاہنواز۔ کیا تو مجھ پر اس خون کا الزام رکھے گی۔

زبیدہ۔ بیشک۔ قطعی

شاہنواز۔ کچھ پروا نہیں چڑیل عورت میں تیرے مکر سے تیرا غلام نہیں بن سکتا

زبیدہ۔ ہاں تو لو۔ ارے دوڑو خدارا دیکھو اس شیطان نے میرے باپکو جان سے مارا

(سپاہیوں کا داخلہ شاہنواز کی گرفتاری۔)

احسن لکھنوی

فلسفۂ مذہب

(بسلسلۂ گزشتہ)

مذہب اور قومیت بس دنیاوی معاشرت میں مذہب کا مخل ہونا یا تو ایک احسان وقتی ہوگا اور یا پھر فضول ولایعنی، اگر وہ اس کی ابدیت اور عمومیت پر اصرار کرے۔ کیونکہ اس کی پابندی صرف ایک ہی مخصوص قوم سے ایک ہی زمانے میں ہوسکتی ہے اور ایسی صورت میں مذہب صرف ایک دنیاوی قانون و رسوم کی صورت اختیار کرکے قومیت کا مرادف بنجاتا ہے اور جب مذہب قومیت کی جگہ لے لیتا ہے تو قومیت کی لعنت المضاعف ہوجاتی ہے۔ فلسفی شیراز سعدی نے بالکل ٹھیک کہا ہے

"ایماں برائے طاعت و مذہب برائے جنگ"

مسلمان میری اس تحریر پر آپے سے باہر نہ ہوں بلکہ خود قرآن سے اس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ نماز روزہ اور زکوٰۃ اسلام کے رکن عظیم ہیں۔ قرآن نے اُن کو بجا طور سے فرض کیا ہے کہ یہ اعتقاد صالح کی عملی صورت ہے۔ ہر انسان پر تین حقوق ہیں اور ان اعمال کی بجا آوری درحقیقت ان تین حقوق کی بجا آوری ہے نماز خالق کے حقوق کی بجا آوری۔ زکوٰۃ حقوق عباد اور روزہ حقوق نفس کی بجا آوری ہے۔ مگر یہ عجیب و عجیب بات ہے کہ ان کے عملی طریقوں کے لئے قرآن نے اس قدر اختصار و ابہام سے کام لیا ہے کہ سوائے اُس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ قرآن کا مقصد صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کے سامنے اسلام پیش کرنے کا ہے۔ اور خدا جانتا ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں کے طبائع ایسے واقع ہوئے ہیں کہ ان پر ایک مخصوص زبان و طریقے کے ساتھ عبادت تکلیف مالا یطاق سے کم نہ ہوگی اور اگر وہ بجا بھی لائیں گے تو بغیر رجوع قلب کے۔ ارکٹک کا رہنے والا اسکیمو جو برف کے مکان اور نصف سال کی رات میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ یقیناً عرب کے طریقہ پر عبادت کرنے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے معذور رہے۔ اس لئے قرآن کا صاف و صریح منشا عملی طریقوں پر سکوت اختیار کرنے کا یہی تھا کہ عبادت محض خدائے واحد کی ہو کیونکہ وہ مذہب کا ایک رکن عظیم ہے۔ خواہ وہ کسی طریقہ سے ہو۔ اس خیال کی تائید خود قرآن کی ان آیتوں سے ہوسکتی ہے۔

(۱) ان الذین آمنو و الذین ہادو و النصاریٰ و الصابئین و المجوس من آمن باللہ و عمل صالحاً فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

(۲) لکل امۃ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر و ادع الی ربک انک لعلیٰ ھدی مستقیم

(۳) قل یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدو بانا مسلمون۔

برخلاف اس کے دنیاوی و معاشرتی احکام جن کا مقصد عربوں کو اصول تمدن سکھانے کے سوا دوسرا نہ تھا مثلاً طلاق۔ وراثت و حجاب و اعتاق و کتابت وغیرہ۔ ان کی نسبت قرآن نے کافی وضاحت سے کام لیا ہے۔ لہذا قومی مذہب ایک قومی شریعت کیساتھ

عمومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ کبھی وہ ایک قوم سے باہر پھیل سکتا ہے۔ جب تک کہ وہ سب مل کر خود ایک علٰحدہ قوم نہ بنجائیں۔ اور اگر یہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا تھا اس وقت کے عرب عموماً سوتے وقت اپنے سارے کپڑے اُتار کر برہنہ سوتے تھے اور اس زمانے کی عرب کی عورتیں بالکل اسی طرز پر رہتی تھیں۔ جیساکہ موجودہ زمانے کی بدوی عورتیں دیکھی جاتی ہیں۔ اُن کو پیروں میں جھانجھ یا پازیب پہننے کا شوق تھا اور اس کے ساتھ وہ اپنا سینہ کھلا رکھتی تھیں۔ اب دیکھو اگر قرآن کا ہر ایک حکم ہر زمانے اور ہر قوم پر فرض سمجھا جائے تو ان احکام کی تعمیل کہ کسی کے سوتے وقت بلا اذن اس کے خلوت میں نہ جاؤ۔ یا عورتوں کے لئے جب وہ چلیں تو اپنے پازیبوں میں آواز پیدا کرتی ہوئی نہ چلیں اور اپنے سینوں کو دوپٹوں سے بند رکھیں، اُن قوموں کے لئے جن کی یہ قومی عادتیں نہیں ایک فضول حکم ہوگا۔ اسی پر وضو و طہارت کے دوسرے احکام کو قیاس کر لو۔ اسی اصول سے یہ بات بھی واضح ہوجائے گی کہ شریعت اسلامی میں۔ چوری زنا۔ قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں اُن میں کہاں تک عرب کے رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ موجودہ صورت میں اختلاف زمانہ کے لحاظ سے کہاں تک اجتہاد کی گنجائش ہے۔

غالباً حضرت شاہ ولی اللہ نے متاخرین میں سے اس نکتہ کو ایک حد تک سمجھا ہے۔ چنانچہ وہ حجتہ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

ولہذا المعنی اختلف شرائع الانبیاء۔ والراسخ فی العلم یعلم ان الشرع لم یجی فی النکاح والطلاق والمعاملات والزینۃ واللباس والقضاء والحدود ــــ بما لم یکن لہ بہ علم اد تیر دون فیہ اذا کلفو نعم انما وقع افامسہ المسموع والصحیح السقیم

اور اسی وجہ سے انبیاء کی شریعتیں مختلف ہیں اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ جانتے ہیں کہ شریعت نے نکاح۔ طلاق و معاملات آرائش۔ لباس۔ قضا و تعزیرات وغیرہ میں کوئی ایسی بات پیش نہیں کی جسکو وہ لوگ پہلے سے نہ جانتے ہوں یا ایسے سئلے جن کو قبول کرنے میں ان کو پس و پیش ہو۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ جو کجی تھی وہ سیدھی کردی گئی اور جو خرابی تھی رفع کردیگئی۔

(حجتہ اللہ البالغہ)

آگے پھر فرماتے ہیں۔

فکذالک یعتبر فی الشرائع علوم مخزونۃ فی القوم و اعتقادات تجاری فیہم ولذالک نزل تحریم اللحوم لابل والبانہا علی بنی اسرائیل دون بنی اسمعیل ولذالک کان الطیب والخبیث والمطاعم مفوضاً الی عادات العرب ولذالک حرمت بنات الاخت علینا دون الیہود

اسی طرح شریعت میں ان علوم و اعتقادات و عادات کا لحاظ کیا جاتا ہے جو قوم میں جاری و ساری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل پر حرام ہوا اور بنی اسمٰعیل پر حرام ہوا اور یہی وجہ ہے کہ کھانوں میں پاک اور نجس کی تفریق عرب کے مذاق پر محمول کی گئی اور یہی وجہ ہے کہ بھانجی سے شادی کرنا ہمارے مذہب میں حرام ہے اور یہود کے ہاں نہیں ہے۔

اسی بحث میں آگے چلکر لکھتے ہیں۔

واعلم ان کثیرا من العادات والعلوم الکامنة یتفق فیہا العرب والعجم وجمیع سکان الاقالیم المعتدلة واہل الامزجة القابلة لاخلاق الفاضلة کالحزن لمیتہم والاستحباب الرفق بہ کالتفخر بالاحساب والانساب فتلک العادات والعلوم احق الاشیاء بالاعتبار ثم بعدہا عادات وعقاید تختص بالمبعوث علیہم فتعتبر تلک ایضا

جاننا چاہیے کہ بہت سے مراسم اور علوم ایسے ہیں جن میں تمام عرب وعجم اور تمام معتدل ممالک کے رہنے والے اور تمام وہ لوگ جن میں اخلاق فاضلہ کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے سب متفق ہوئے ہیں مثلاً مردہ کا غم کرنا اور ان پر رحم کھانا یا مثلاً حسب و نسب پر فخر کرنا تو یہ مراسم اور یہ اصول سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں ان کے بعد وہ مراسم ہیں جو خاص اسی قوم میں جاری ہیں جس پر وہ پیغمبر مبعوث ہوا ہے تو ان مراسم کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ پیغمبر جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے اس کی شریعت میں اس قوم کے عادات اور خصوصیات کا خاص طریقے پر لحاظ ہوتا ہے لیکن جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہو اس کے طریقہ تعلیم میں یہ اصول چل نہیں سکتا کیونکہ نہ تو وہ تمام دنیا کی قوموں کے لئے الگ الگ شریعتیں بنا سکتا ہے اور نہ تمام قوموں کی عادات اور خصوصیتیں باہم متفق ہو سکتی ہیں۔ اس لئے وہ پہلے اپنی قوم کی تعلیم و تلقین شروع کرتا ہے اور آپ کو محاسن اخلاق کا نمونہ بنا دیتا ہے اور یہ قوم اس کے اعضا اور جوارح کا کام دیتی ہیں اور اسی کے نمونے پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرنا چاہتا ہے۔ اس کی شریعت میں اگرچہ زیادہ تر قواعد اور اصول عام ہوتے ہیں جو قریباً تمام دنیا کے لوگوں میں مشترک ہوتے ہیں تاہم اپنی قوم کی عادات اور خصوصیات کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے لیکن جو احکام ان عادات اور حالات کے بنا پر قائم ہوتے ہیں ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ اسپر چنداں زور دیا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے صفحہ ۱۲۳ میں اس اصول کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔

وہذا الامام الذی یجمع الامم علی ملة واحدة تحتاج الی اصول الاخری غیر الاصول المذکورة فیما سبق منہا ان یدعو قوما الی السنة الراشدة ویزکیہم ویصلح شانہم ثم یتخذہم بمنزلة جوارحہ ۔۔۔ وذالک لان ہذا الامام نفسہ لا یتأتی منہ مجاہدة امم غیر محصورة واذا کان کذالک وجب ان یکون مادة شریعتہ ما ہو بمنزلة المذہب الطبیعی لاہل الاقالیم الصالحة عربہم وعجمہم ثم ما عند قومہ من العلم والارتفاقات ویراعی فیہ حالہم اکثر من غیرہم ثم یحمل الناس جمیعاً علی اتباع تلک الشریعة لانہ لاسبیل الی ان یفوض الامر الی کل قوم او الی ائمة کل عصر اذ لا یحصل منہ فائدة التشریع

یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے اس کو اور چند اصول کی، ''جو اصول مذکورۂ بالا کے علاوہ ہیں'' حاجت پڑتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست پر بلاتا ہے اس کی اصلاح کرتا ہے اسکو پاک بناتا ہے۔۔۔

یہ اس لئے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یہ امام تمام قوموں کی اصلاح میں جان کھپائے اس لئے ضرور ہوا کہ اس کی شریعت کی اصلی بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب وعجم کا فطری مذہب ہو اس کے ساتھ خاص اس قوم کی عادات اور مسلمات کے اصول بھی لئے جائیں اور انکے حالات کا لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا جائے۔ پھر

اصلاً ولا الی ان ینظر ما عند کل قوم ویمارس کلاً منہم فیجعل لکل شریعۃ فلا احسن ولا ایسر من ان یعتبر فی الشعائر والحدود والارتفاقات عادۃ قومہ المبعوث منہم فلا یضیق کل التضییق علی الآخرین الذین یاتون بعد"

تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی تکلیف دی جائے کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم اور ہر پیشوا ئے قوم کو اجازت دیجائے کہ وہ اپنی شریعت آپ بنالیں (مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں مصنف) ورنہ تشریع محض بیفائدہ ہوگی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کی عادت وخصوصیات کا تجسس کیا جائے۔ اور ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت بنائی جائے اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی طریقہ نہیں کہ شعار تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کی عادت کا لحاظ کیا جائے جس میں امام پیدا ہوا ہے اسکے ساتھ آنیوالی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سختگیری نہ کی جائے۔

اب دیکھنا چاہئے کہ مذہب کے اصول و فروع کیا ہیں اور مذہب کا تعلق قومیت وحکومت سے کہاں تک ہے اور مذہب کی عملی پیروی سے قومیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہم اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لئے پہلے ایک شجرہ ترتیب دیتے ہیں اور پھر اس کی تشریح کریں گے۔

مذہب اسلام

- عبادات (نبوت)
  - ایمان
  - عمل صالح
  - اخلاق
    - خدا، نبوت، حشر ونشر وغیرہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ، اوامر، نواہی
- معاملات (سلطنت یا خلافت)
  - احکام دیوانی مثل وراثت نکاح مہر۔ طلاق۔ بیع وشرا
  - تعزیرات
  - جہاد
  - سیمیات
    - جمعہ وعیدین ختنہ و عقیقہ۔ طریقہ معاشرت وطہارت ماکولات

یہ صحیح ہے کہ مذہب بغیر سلطنت کے ایک فلسفہ ہے اور اس بنا پر میں نے مذہب کے ماتحت عبادات و معاملات کی دو شاخیں نکالی ہیں جنہیں ایک قابل تبدیلی ہے، حسب حال زمانہ وقوم۔ اور دوسرا ازلی۔ یا یوں کہئے کہ ایک کا تعلق نبوت وروحانیت سے ہے اور دوسرے کا مادیت اور سلطنت سے۔ اس لئے مذہب کے معنی درحقیقت نہایت وسیع ہوئے۔ یعنی انسان کا ہر فعل ایک طور سے مذہب کے ماتحت آجاتا ہے۔ خود مذہب کے لفظی معنے سے یہی مطلب نکلتا ہے جس کا مادہ ذہب ہے جس کے معنے چلنے کے ہیں۔ یعنی انسانی روش وطریقے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کی مختصر تعریف "علم" ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ "کافر" یا مذہب سے بیگانہ کے لفظی معنی عربی میں وہی ہیں جو انگریزی لفظ (Pagan) یا (Heathen) کے ہیں کافر جس کی جمع کفار ہے اس کے بھی معنی کاشتکا

وکسان و دیہاتی کے ہیں قرآن میں ہے کمثل الغیث یعجب الکفار ـــــ عربی میں کسی دیہات کو کہیں گے کفر فلاں یعنی فلاں قریہ اور یہی سنے انگریزی الفاظ کے ہیں تو گویا کافر یعنی غیر مسلم ایک اجڈ بے علم دہاتی ہے۔ اس کے برخلاف ایک مومن یا مسلم ایک تعلیم یافتہ مہذب شہری ہوا اور یہ ہمارے پہلے قول کی تائید ہے کہ وحشیوں کو مذہب سے کوئی سروکار نہیں مختصر یہ کہ "بے علم تواں خدا را شناخت"۔

ایک پیغمبر جب کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو وہ قوم دنیاوی حیثیت سے متمدن ہے۔ اور اس صورت میں پیغمبر صرف مجدد روحانی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کو شریعت وحکومت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ جیسا مسیح کی نبوت اور اگر وہ قوم بالکل ہی وحشی ہے تو نبوت نہ صرف روحانی تعلیم کے لئے ہوتی ہے بلکہ شریعت وحکومت بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے آخری صورت میں قوم کی اصلاح بذریعہ نبوت اس طرح شروع ہوتی ہوگی۔ کہ پہلا کام جو نبی کریگا یہ ہوگا کہ وحشی کو بتلائے کہ فلاں کام اچھا ہے۔ فلاں کام برا ہے اور وحشی کو اس وقت ایک اچھے کام کی رغبت اور دوسرے سے نفرت ہوگی جب ایک کے کرنے پر اس کو انعام ملیگا یا کم سے کم اگر انعام نہ ملیگا تو دوسرے کے کرنے پر اس کو عقوبت ضرور دیجائیگی اس تمیز کے لئے نبی کو تعزیرات وحکومت سے کام لینا پڑا ہوگا۔ اور یہ صورت اس وقت تک کے لئے کافی ضمانت ہوگی جب تک وحشیوں کی صرف ایک مختصر جماعت ہو تاکہ نبی اس کے ہر فعل کی نگرانی کر سکے۔ لیکن فرض کرو کہ جماعت عظیم ہے اور مختلف فرقوں میں منقسم ہے۔ ایک وحشی چھپ کر برائی کرنے کا اکثر موقع پاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ خاموشی سے اپنی ہم جنس کی نہیب وغارت کو اس کو عقوبت سے بچائے رکھے گی یا اگر کسی طرح نبی کو اس کی خبر ہوگی تو وہ جاکر ایسی جماعت میں شامل ہو جائیگا جو نبی کے دسترس سے باہر ہو۔ جب نبی نے دیکھا کہ وحشی کو برائی سے روکنے کے لئے اس کی دنیاوی تعزیر کافی نہیں ہوئی تو لامحالہ وہ ایسی تدبیر سوچیگا جس کے ذریعہ سے وحشیوں کے قلوب موثر ہوں اور اُن کو خود بخود بدی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت ہو۔ تو ہم نے دیکھا کہ پہلے وحشی کو سمجھانا کہ فلاں کام اچھا ہے اور فلاں کام برا ہے۔ کافی نہ ہوا۔ اس کے بعد اچھے کام پر انعام اور ہر کام پر عقوبت بھی کافی نہ ہوئی اب تیسری صورت اگر باقی ہے تو یہی ہے کہ خود بدی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت اسکی طبیعت ثانیہ بنا دی جائے اور یہیں سے اصل مذہب کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر ان سب کا مقصد وہی ایک ہے یعنی دنیا میں امن وسلامتی اور بقائے قوم ہے ـ

ہم یہاں پر یہ بحث کرنا نہیں چاہتے کہ صاحبان بصیرت وارباب نبوت نے کس طرح اپنی قوموں کو خدا شناسی کی تعلیم دی اور ان کو یقین دلایا کہ موت کے بعد ان کی زندگی پھر قائم ہوگی اور خدا ان کو پچھلے اعمالوں کی سزا دیگا۔ مگر اس تلقین کا مقصد ظاہر ہے کہ سوائے اسکے کچھ نہیں کہ جو باتیں حکومت وتعزیرات دنیوی سے حاصل نہ ہوں وہ اس صورت سے حاصل ہو جائیں۔ شائد ابتداہی میں خدا کو ایک خدا سمجھنا اس قدر ضروری نہ رہا ہو جتنا اُس کو موت کے بعد حشر ونشر سزا و جزا پر قادر سمجھنا کہ یہ خطرہ ایک وحشی کو انسانیت کے جامے میں لانے کے لئے سب سے زیادہ موثر سبب بنجاتا ہے۔ جب وحشی کے دل میں اس خیال سے خشیت پیدا ہوئی تو وہ برائی کرنے پر ل ہوا پھر اس خیال کے راسخ ہونے کے لئے نفسیات کے عام اصول پر متواتر عمل صالح کی تلقین کی گئی۔ جس کا طبعی نتیجہ نیکی سے انتساب اور بدی سے احتراز ہے اور یہی اصل مذہب ہے۔ اس لئے مذہب اور حکومت کا تعلق چولی دامن کا سا ہے اور جس طرح مذہب حکومت کا عصا ہے۔ اسی طرح حکومت کا عصا مذہب ہے۔ لیکن جتنے مذاہب دنیا میں اسوقت ہمارے سامنے ہیں انمیں صرف

اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ باوجودیکہ اس نے اپنے ابتدائی نشوونما میں قومی مذہب کی صورت اختیار کی۔ قرآن نے اس کو واضح کردیا کہ اصول مذہب کی حیثیت سے وہ عالمگیر مذہب ہے اور یہ دعوی سب سے پہلے اسلام ہی نے کیا۔

مسلمان کوئی قوم نہیں بلکہ وہ ایک مذہب کی پابند جماعت ہے۔ قوم ہونے کی حیثیت سے ہم کو ہموطن غیر مسلم قوم کی معاشرت سے جدا معاشرت قائم نہ کرنا چاہئے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ خیال اب موجودہ ترکی و مصر و شام میں جاگزیں ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے ہندوستان کے مسلمان ابھی تک ایک علیحدہ قوم بنے ہوئے ہیں۔ ورنہ اگر شرک و بت پرستی کو علیحدہ کرلیا جائے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی ہولی و دیوالی و دسہرہ کو قومی تہوار و مراسم سمجھنے یا گائے کے گوشت سے احتراز کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا عرب کے مسلمانوں کو ختنہ و عقیقہ و حج و عیدین کے مراسم بجالانے اور سور کے گوشت سے پرہیز، یا عجم کے مسلمانوں کے جشن نوروز کے منانے میں۔ خلفاے عرب سے نفرت کرنے کا جس مذہب نے قومیت و قومی شعار کو مذہب سے علیحدہ رکھا ہے وہ دنیا میں نہ صرف تبلیغی حیثیت سے بلکہ مادی طریقہ سے برسرارتقا ہے اور جو کسی قسم کی تبلیغی یا مادی ترقی سے محروم ہے وہ وہی مذہب ہے جو قومیت کے مرادف ہوگیا۔ لوگوں کا یہ غلط خیال ہے کہ مذہب دنیا میں سب سے زیادہ خونریزی کا باعث ہوا ہے وہ مذہب نہیں ہے۔ بلکہ قومیت کی ایک صورت ہے۔

خلاصہ اس ساری بحث کا یہ ہوا کہ تمام وہ باتیں جن کا اثر ہر قوم و ہر زمانے میں عام نہیں وہ سب مذہب کے فروع ہیں اور اس میں احکامات دیوانی و فوجداری و جہاد۔ قومی مراسم بلکہ طریقۂ عبادات بھی شامل ہیں۔ مذہب کی عملی پابندی کے لئے اگر ایک شریعت ضروری ہے تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی دنیا کے اندر ہر قوم و ہر زمانے میں ابو حنیفہ پیدا ہوا کریں جو اپنے ملکی حالات و معاشرت کو پیش نظر رکھ کر اجتہاد کریں۔ مگر پہلی صدی ہجری کے ائمہ کے قیاسات مذہب کے عام اصولوں کے ساتھ دوامی سمجھنا اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے بہت بڑا ہے اور خود "قوم" اسلام کی دنیاوی ترقی کا سدباب ہے۔ یہ ایسی غلطی ہے جسکا خمیازہ ہم نے ابتک اٹھایا ہے یورپ کی نشست و برخاست و لباس اور عرب کے نشست و برخاست و لباس میں زمین آسمان کا فرق ہے عرب اپنی مسجد میں زمین پر بیٹھکر آسانی سے عبادت کرسکتا ہے مگر یورپ کرسی کا عادی ہے۔ کیوں نہ یورپ کا ابو حنیفہ عبادت کا طریقہ ان کے عادت کے موافق اجتہاد کرے جب کہ قرآن نے مصلحتاً اس میں سکوت اختیار کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ قرآن نے اوقات نماز کی تعیین اس خوبی سے کی ہے کہ اگر ہم حدیث کی مدد نہ لیں تو ہم یورپ کے لئے صرف تین وقت کی نماز متعین کرسکتے ہیں ——— کیونکہ ظہر و مغرب کی نماز کی کہیں صراحت نہیں کی گئی عرب جو اپنا بیشتر وقت قہوہ خانوں کی گپوں میں صرف کرتے ہیں وہ پانچ نہیں بلکہ پچاس وقت کی نماز پڑھیں تو بہتر ہے۔ مگر یورپ کے ایک مشغول کاروباری سے کہو کہ تم مغرب کے وقت جبکہ وہ اپنے کام سے راحت پاتا ہے یا ظہر کے وقت کوئی نماز ادا کرے اور اسی پر اس کے اسلام کا انحصار ہو تو وہ کیونکر اسلام کو فطری مذہب مان سکتا ہے۔ جب میں نے حدیث کی مدد سے قرآن کے سمجھنے کی کوشش کی تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا ——— کہ حدیث ہمکو یہودی بنا دیتی ہے اور قرآن ہم کو مسلم۔ اور اب مسلمانوں کو اختیار ہے خواہ وہ یہودی بنیں یا مسلم۔ صرف قرآن کی ایک آیت لیلو۔

ولا تطرد الذین یدعون ربہم بالغدوۃ والعشی یریدون وجہہ ما علیک من حسابہم من شیٔ وما من حسابک علیہم من شیٔ فتطردہم فیکون من الظالمین

اس کے مقابلہ میں آمین بالجہر اور رفع یدین پر تکفیر کے فتووں کو دیکھو کیا قرآن کا یہ قول ہم پر صادق نہیں آتا - ان قومی اتخذ و فرانا محجورا۔ چونکہ ہمکو فلسفہ مذہب میں محض اصول مذہب پر بحث کرنی ہے ہمنے سوچا کہ اگر ہم ایک مذہب کا معیار مقرر کر کے اس پر بحث کریں گے تو بہترین معیار ہمارے لئے اسلام ہوگا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ خیال بھی ہے کہ مذہب اسلام کے جزو اعظم یعنی معاملات کو کیونکر نباہیں گے - اس لئے ہمنے اس عنوان میں مذہب اور قومیت کی بحث کر کے اسلام کو ان مجہولات سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے جو غالباً بعض کے نزدیک بقول غالب۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ ؎

اور بعض کے نزدیک بقول رومی - "استخواں پیش سگاں انداختن" ہوگا

باقی ۔۔۔۔۔۔۔ باقی

سیّد مقبول احمد

اِعلان

ہندوستانی ایکاڈیمی کو ایسے مترجموں کی ضرورت ہے جو انگریزی سے بامحاورہ اردو ہندی زبانوں میں ترجمہ کر سکیں۔

مترجم ایکاڈیمی کے ملازم نہ ہوں گے - جو لوگ سائنس اور ادبی کتابوں کا ترجمہ کرنا چاہتے ہوں ان کو نمونے کیساتھ ۳۰ رجون تک درخواست دینا اور شرائط طے کر لینا چاہیے۔

(ڈاکٹر) تارا چند

جنرل سکریٹری ہندوستانی ایکاڈیمی الہ آباد

چنگاری

(فسانہ)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

۹

یوسف کے قیام کو دارجلنگ میں ایک مہینے سے زیادہ زمانہ گزر گیا ہے اور روز ولا (کوٹھی) میں جو ایک مرتفع مقام کے بہترین کنج میں واقع ہے ٹھہرا ہوا ہے۔ مس گارڈن جس نے اپنی ساحرادائوں سے کام لیکر یوسف پر ایک قاہرانہ قبضہ قائم کر رکھا ہے، اس کی شب و روز کی جلیس ہے اور ہر صبح، شام کے لئے ایک جدید "لائحۂ نشاط" مرتب کر کے یوسف کی شب بھر کی "خستۂ معصیت" روح میں نئی زندگی پیدا کر دیتی ہے۔

یوسف جس کی پیدائش اور تعلیم و تربیت نہایت ہی معصوم اور پاکیزہ ماحول میں ہوئی تھی اور جوان ہونے کے بعد بھی عرصہ تک یہی سمجھتا رہا کہ "سنگ میل راہ" کی طرح ساکت لیکن رہنمایانہ زندگی بسر کر دینا ہی عین مقصود حیات ہے، کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس عالم کے ماوراء بھی کوئی عالم ایسا ہو سکتا ہے، جو اس کی توجہ کو جلب کر سکے۔ مس ہلن سے ملنے کے بعد اول اول تو وہ صرف اس قدر سمجھ سکا کہ عورت کا وجود اس قدر زیادہ غیر ضروری اور دلچسپ وجود نہیں ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کی اہمیت روشن ہونے لگی، یہاں تک کہ مس ہلن کے سامنے اس نے اپنی شکست کا اعتراف کیا اور انتہائی شغف کے عالم میں اپنا وہ سب کچھ اس کے قدموں پر ڈالدینا چاہا جس پر ایک مرد ناز کر سکتا ہے۔ لیکن جب اس کو رد کر دیا گیا تو پھر یہ امر اس کے اختیار سے باہر تھا کہ وہ اپنی وسیع ہو جانے والی تمناؤں کو سمیٹ سکتا۔ شاہین جب کسی شکار کے لئے فضا میں بلند ہوتا ہے تو پھر اس وقت تک وہ نیچے نہیں آتا جبتک کہ کوئی دوسرا طائر اس کے خواہش صید کو پورا کرنے والا نہ ملجائے۔ یوسف میں اس نوع کی خواہش پرواز مس ہلن ہی کو دیکھ کر بلکہ اسی کی ترکیبوں اور کوششوں سے پیدا ہوئی تھی پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ مس ہلن کا فریب شعبدہ کھانے کے بعد وہ چین سے بیٹھ جاتا، اس کے اندر آگ بھڑک چکی تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر کوئی بجھانے والا نہ ملا تو پھر اس کا جلکر خاک ہو جانا یقینی ہے۔

پھر چونکہ، شباب کی سربند مینا نے جوش میں آجانے کے بعد اس کی بصارت زائل کر دی تھی، اس کے دل و دماغ میں جیسا کہ ہمیشہ زہد و ورع کے ردعمل کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، اب صرف یہی ایک خیال جاگزیں تھا کہ دنیا کی "لذت و نشاط" کو کیونکر اپنے لئے مخصوص کر لیا جائے اس لئے عین اسوقت جبکہ وہ مس ہلن نہیں بلکہ صرف ایک عورت کے لئے بیتاب تھا، مس گارڈن کا ملجانا گویا سیلاب کے لئے ساحل کا ٹوٹ جانا تھا۔ کہ پھر پانی کی رو کا رخ متعین کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ الغرض وہ گرا اور بری طرح گرا، اگر کبھی وہ ہوش میں آتا بھی تو اُسے تکلیف ہوتی کہ کیوں "این و آن" کے خیال سے اس پرلطف خواب کی لذت کو تباہ کیا جائے

شباب بجائے خود ایک ایسا زبردست طوفان ہے کہ اس کو روکنے کی کوشش کرنا، گویا فطرت کے رخ کو بدل دینا ہے، چہ جائیکہ اس کی اعانت کے لئے حسن و شراب بھی موجود ہو کہ یہیں آ کر صحیح معنے میں انسان کی مجبوری ثابت ہوتی ہے ——— دن گزرتے گئے، تعلقات قلب کی بندشیں قوی ہوتی گئیں، معصیت عادت میں اور عادات طبیعت ثانیہ میں بدلتی گئی، یہاں تک کہ دو مہینے کے اندر ہی یوسف کی قلب ماہیت ہو گئی اور سارے دارجلنگ میں اس سے زیادہ شراب خوار، اس سے زیادہ قمار باز، اس سے زیادہ جری رندِ شاہد باز اور اس سے زیادہ خوش ادا رقص کرنے والا کوئی اور نہ تھا، گویا تہذیب کلب کے تمام معیاری اخلاق اس میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے وہ یہاں ایک نواب کی حیثیت سے رہتا تھا اور نواب ہی کی طرح بیدریغ روپیہ صرف کر رہا تھا۔

ایک دن شام کو وہ پوری کیفیت شراب میں بیٹھا ہوا صرف حال کی لذتوں کو سرمایۂ حیات سمجھکر ان پر مسرور ہو رہا تھا کہ خادم نے حبیب کا کارڈ لا کر اس کو دیا۔

حبیب! حبیب!! اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد حبیب کے ساتھ اُس نے مس ہلن کو بھی ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے شاید کسی نہایت گہرے خواب سے بیدار ہو رہا ہے، اور اسی کے ساتھ جب مس ہلن کی تمام گزشتہ بے اعتنائیاں، (جن کے بھلانے ہی کے لئے اُس نے یہ تمام کارگاہ نشاط قایم کی تھی) یاد آئیں، تو اس کی مردانہ غیرت و خودداری میں پھر ایک تحریک پیدا ہوئی اور اس نے کوشش کر کے اپنی حیرت، اپنی مسرت اور تمام ان کیفیات کو جن سے حبیب یا مس ہلن کو معلوم ہو سکتا کہ اسپر کوئی خاص اثر ہے، ضبط کیا اور نہایت ہی غیر متاثرانہ انداز سے اُس نے کھڑے ہو کر ان دونوں کی پذیرائی کی اور قریب کی کرسیوں پر بیٹھنے کی درخواست کر کے خود بھی بیٹھ گیا اور ہاتھ ملتے ہوئے مصنوعی تبسم چہرہ پر پیدا کر کے نہایت رسمی شکریہ تکلیف فرمائی کا ادا کیا اور میز سے سگریٹ کا ڈبہ اٹھا کر پیش کیا۔ دونوں متحیر تھے اور یوسف کے اس پر تکلف اور اجنبی طرز ملاقات کی کوئی تاویل نہ کر سکتے تھے۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد مس ہلن نے ایک خاص بندار اعتماد کے ساتھ چہرہ پر تبسم پیدا کر کے کہا "مسٹر یوسف یہ دیکھکر بہت خوش ہوئی کہ اب آپ کی صحت غیر معمولی طور پر شگفتہ نظر آتی ہے"! یوسف نے اس کے اندر چھپے ہوئے نشتر کی چبھن کو محسوس کیا اور حد درجہ مستغنی انداز سے بولا کہ "جی ہاں اس سے قبل موسیٰ پر بھی یہی گزرا تھا۔ کہ گئے تھے آگ لینے مگر ہاتھ آ گئی پیمبری، مجھے کیا خبر تھی کہ کبھی "وہم" کا تعاقب کرنا بھی "حقیقت" تک پہونچا دیتا ہے"۔

یہ سنکر مس ہلن کے چہرہ پر غصہ کا سرخ رنگ دوڑ گیا، اس نے اگر نشتر کا استعمال کیا تھا تو جواب تیر سے دیا گیا۔ یوسف نے اسکو محسوس کیا اور نہایت اطمینان سے گفتگو کا رخ اور لب و لہجہ بدلکر سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں دیکھتا ہوں کہ میں نے کافی جوش کے ساتھ آپ کی پذیرائی نہیں کی، لیکن اس سے یہ نہ خیال کیجئے کہ میرا دل مسرت سے خالی ہے۔ باور کیجئے میں حیران ہوں کہ آپ لوگوں کی اس زحمت کی تلافی کیونکر مجھ سے ممکن ہے"۔

یوسف کا یہ خشک انداز، یہ بے پروایانہ طریق پذیرائی اور اسی کے ساتھ گفتگو کا وہ طعن جس میں زہر سے زیادہ نفرت پنہاں تھی

ایک ایسا خلاف توقع انکشاف تھا کہ مس ہلن ششدر رہگئی اور دیر تک کچھ سوچتے رہنے پر مجبور

دو ہی دن کے قیام میں یوسف کی آزادی کے تمام حدود حبیب و ہلن پر روشن ہوگئے اور حبیب نے باوجود مس ہلن کی مخالفت کی آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ اس کو کسی طرح مجبور کرکے یہاں سے واپس کرنا چاہئے۔ ایک صبح گفتگو اسی ارادہ سے شروع کی گئی لیکن حبیب نے اسکی ابتدا ہی کی تھی کہ یوسف نے ایک ایسی ہنسی کے ساتھ جس میں نہایت قوی عزم شامل تھا کہا کہ "حبیب میں ابھی دارجلنگ نہیں چھوڑ سکتا۔ اور اگر دارجلنگ چھوڑ دوں تو بھی یہ ممکن نہیں کہ گھر واپس جاؤں اگر یہاں نہ رہوں گا تو پھر وہاں جاؤنگا جہاں اس سے زیادہ سامان دلچسپی میرے لئے مہیا ہو"

حبیب "کیا گھر میں اس سے زیادہ سامان دلچسپی فراہم نہیں ہو سکتے"

یوسف۔ (بے اختیار ہنسکر) آپ پروفیسر ہوکر ہر مخاطب کو بچہ ہی سمجھنے لگے، کچھ اور ذکر کیجئے۔ دنیا میں ناصح بننا کوئی مستحسن فعل نہیں ہے کسی کو نصیحت کرنا، اس کو بیوقوف سمجھنا ہے اور آپ بیوقوف کو بھی بیوقوف کہیں گے تو اسے غصہ آجائے گا، یہی ہے انسانی دماغ کی سائکالوجی"

مس ہلن۔ "نصیحت ہمیشہ دانشمند ہی کو کیجاتی ہے کیونکہ اسی سے توقع سننے اور سمجھنے کی ہوتی ہے"

یوسف۔ (ہنسکر) کم ازکم آپ تو مجھے دانشمند نہ کہئے، آپ خوب واقف ہیں کہ مجھ میں بیوقوف بن جانے کی کتنی صلاحیت موجود ہے وہ تو کہئے بالکل حسن اتفاق تھا کہ خود فراموشی کی دنیا مجھے نصیب ہوگئی، ورنہ کسی پر دسترس حاصل کرنے کے لئے میں تو سر دینے کیلئے بھی تیار ہوجاتا"

تھوڑی دیر کے لئے سناٹا ہوگیا، حبیب خاموش تھا اور مس ہلن سر سے پاؤں تک عرق عرق۔ مس ہلن کے لئے یوسف کا یہ فقرہ ایسا سخت طعن تھا اور اس کی آخری تحریر کا (جسے وہ دارجلنگ ہوٹل میں چھوڑ گئی تھی) اس قدر نشتریں جواب تھا کہ وہ اپنی جگہ تڑپ کر رہگئی اور اپنی خفت کو مٹانے کے لئے سوائے اس کے کچھ نہ کہہ سکی کہ "اگر آپ خفا ہوتے ہیں تو میں ایسی گفتگو نہ کرونگی"

یوسف۔ میں ! اور آپ سے خفا !! محسن سے خفا ہوجانا تو فطرت انسانی کے خلاف ہے، آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتی ہیں۔ اگر میرے لب و لہجہ سے آپ نے ایسا خیال کیا تو میں کوشش کرونگا کہ حقیقت سے ہٹ کر آپ سے گفتگو کروں تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو

حبیب نے یہ دیکھکر کہ گفتگو نے غلط پہلو اختیار کرلیا ہے، قطع کلام کرکے کہا کہ "یوسف، سنو، مجھے یہ گفتگو مطلق پسند نہیں، خیال کی دنیا سے الگ ہوکر عملی دنیا میں آؤ اور پھر غور کرو کہ تمہاری موجودہ حالت کہاں تک قابل برداشت ہے

مجھے صاف صاف کہنا چاہئے کہ تمہاری یہ فضول خرچیاں، عیاشیاں، بیباکیاں اور خدا جانے کیا کیا کسی طرح مناسب نہیں مجھے حیرت ہے کہ یا تو تمہارا وہ عالم تھا کہ ایک معمولی کسان کے حدود معیشت و معاشرت سے آگے نہ بڑھتے تھے، یا اب یہ کیفیت ہے کہ سارے دارجلنگ میں تم سے زیادہ اوباش کوئی اور نظر نہیں آتا، برا نہ ماننا مجھے حق ہے کہ تمہارے لئے اس سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کروں۔ تم کو سوچنا چاہئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور کب تک اس مکروہ زندگی کو اختیار کئے رہو گے ؟"

یوسف نے نہایت نرمی کے ساتھ جواب دیا کہ "آپ کو جو کچھ کہنا ہے ایک مرتبہ کہہ لیجئے تاکہ میں بھی ایک ہی بار اس کا جواب دیکر خاموش ہوجاؤں"

جیب :- "مجھے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہنا کہ تم میرے ساتھ واپس چلو"

یوسف :- "میں ابھی واپس نہیں جا سکتا - اور شاید کبھی نہیں، اس طرح ابھی نہ میں اس مکروہ زندگی کو ترک کر سکتا ہوں اور غالباً کبھی نہیں، معاف فرمائے میری روح کی بغاوت ایسی معمولی نہیں کہ آپ یا کوئی اور اسپر غالب آسکے جس کی آزادی حاصل کرنے کے بعد کسی طائر کو قفس کی پُرامن زندگی کی دعوت دینا کوئی اچھی قسم کا فریب نہیں ہے - وہ شخص جس نے یہ فیصلہ کرلیا ہو کہ انسانی تگ و دو کی اصلی غایت حصول نشاط ہے تو پھر وہ "اسباب نشاط" کی فراہمی کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہے - اب رہا یہ امر کہ وہ چیز جسے میں "راحت روح یا نشاط زندگی" سے تعبیر کرتا ہوں، وہ حقیقتاً ایسی ہے بھی یا نہیں - سو اس کا معیار مقرر کرنا مشکل ہے یہ بالکل انفرادی چیز ہے - اور اس کو اجتماعی مسئلہ قرار دینا غلطی ہے - اگر میں آپ کی نزدیک اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہوں تو ہونے دیجئے، لطف کی موت، بے لطفی کی زندگی سے اچھی ہے - کل مس گارڈن نے کلب میں پانچ ہزار مجھ سے جیتے اور اس سے قبل بھی ہمیشہ وہی جیت میں رہیں - یقیناً یہ رقم میری حیثیت سے کچھ زاید ہے لیکن میں خوش ہوں کیونکہ اس مادی نقصان کی تلافی جس روحانی نصرت کے ساتھ ہو جاتی ہے وہ کافی سے زائد ہے کیونکہ محبت و خلوص کی ادنیٰ قیمت جان ہے اور یقیناً میری زندگی میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ صحیح معنے میں اس کا تجربہ مجھے حاصل ہوا"

وہ یہ کہتا جا رہا تھا اور مس ہلن کے چہرہ پر ایک غیر معمولی مسرت کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی تھی - جیب نے دیکھا اور تعجب سے دیکھا لیکن چونکہ وہ غریب خود معترف تھے کہ انھوں نے اس وقت تک مس ہلن کا کافی مطالعہ نہ کیا تھا، اس لئے یہ سمجھکر کہ ممکن ہے مس ہلن کی یہ مسرت کسی خاص جذبۂ ہمدردی کے بنا پر ہو خاموش رہگیا۔

اس واقعہ کے بعد دو دن تک مس ہلن اور جیب کا قیام دارجلنگ میں رہا اور یوسف یہ دیکھکر بے انتہا مسرور ہوا کہ مس ہلن اور مس گارڈن کے تعلقات باوجود جدید ہونے کے بہت پُرخلوص تھے اور برخلاف جیب کے مس ہلن نے ایک مرتبہ بھی مس گارڈن کے خلاف کوئی بات نہیں کہی، بلکہ جب ذکر آیا اس کی تعریف ہی کی ....

ان لوگوں کو رخصت ہوئے ایک ہفتہ ہوچکا تھا اور یوسف اپنے مکان میں تنہا بیٹھا ہوا تھا کہ مس گارڈن کا خادم ایک خط ہاتھ میں لئے ہوئے آیا اور بولا کہ میم صاحب کے نام یہ خط رجسٹری شدہ اس وقت کی ڈاک سے آیا ہے انھوں نے حکم دیا تھا کہ ڈاک فوراً ان کو پہونچا دیجائے اس لئے میں اس خط کو لایا تھا کہ انھیں دیدوں۔

یوسف :- "مگر وہ تو یہاں نہیں آئیں - گھر سے نکلے ہوئے کتنی دیر ہوئی؟"

خادم - "ایک گھنٹہ ہوا ہوگا، تو پھر میں یہ خط یہیں چھوڑے جاتا ہوں کیونکہ میرے خیال میں اب وہ آتی ہی ہونگی، ڈاک خانہ جانے کو کہہ رہی تھیں، ممکن ہے وہاں دیر لگ گئی ہو - انھیں کلکتہ ایک بیمہ کرنا تھا"

یوسف :- "بیمہ! کس کے نام، کیا وہاں کوئی انکا عزیز رہتا ہے؟"

خادم :- "عزیز کا حال تو معلوم نہیں، لیکن اس سے قبل کئی مرتبہ میں خود ڈاک خانہ بیمہ کا لفافہ لیکر گیا ہوں، تھوڑی سی انگریزی جانتا ہوں اس لئے میں نے اسپر مس ہلن کا نام پڑھا تھا۔ ان سے ہماری میم صاحب کی بڑی دوستی ہے۔

یوسف (انتہائی حیرت سے) مس ہلن! مس ہلن!!

خادم :- "جی ہاں، مس ہلن، آپ کو نہیں معلوم، ابھی تو وہ آئی تھیں، آپ کے ہاں کئی دن ٹھہری رہیں؟"

یوسف :- "ہاں، ہاں میں جانتا ہوں، لیکن یہ خبر نہ تھی کہ تمہاری میم صاحب سے ان کی پرانی جان پہچان ہے"

خادم :- "بہت پرانی جان پہچان ہے، وہ ہمیشہ دار جلنگ آکر یہیں ٹھہرتی ہیں اور دونوں تک قیام کرتی ہیں، اب کی مرتبہ بھی کئی مرتبہ ان سے ملنے آئی تھیں" یوسف دیر تک خاموش رہا اور اس کا دماغ عجیب و غریب خیالات کا جولانگاہ بنا رہا۔ اول اول جب مس گارڈن کا اُس نے تعارف کرایا تو دونوں بالکل اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملیں اور کسی ادا سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ باہم متعارف نہیں ہیں اس لئے یہ خیال کرکے کہ جو کچھ اسپر ظاہر کیا گیا، بالکل خلاف حقیقت تھا اُس کو تکلیف ہوئی مگر پھر یہ سوچکر کہ خادم کھٹک جائے اس نے ضبط سے کام لیا اور یہ کہکر کہ "ہاں، مجھے اُن کی دوستی کا حال معلوم ہے" اس گفتگو کو ختم کر دیا۔ خادم نے کہا کہ "میم صاحب آتی ہونگی دیدیجئے گا" اور خط میز پر رکھ کر چلا گیا۔

یہ مستطیل لفافہ تھا اور چاروں کونوں پر سرخ لاکھ کی مہریں لگی ہوئی تھیں سواد خط دیکھ کر یوسف سمجھ گیا تھا کہ مس ہلن کا خط ہے، اور چونکہ اسی وقت بالکل نئی بات اِن دونوں کے متعلق معلوم ہوئی تھی اس لئے یہ لفافہ ایک ایسا معمہ ہوگیا، جس کے حل کرنے کے لئے اس کی فطرت بے چین ہو گئی۔

وہ دیر تک خط کو ہاتھ میں لئے ہوئے دیکھتا رہا، غور کرتا رہا کہ اس میں کیا ہوگا۔ اس قدر احتیاط کے ساتھ بھیجنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے الٹ پلٹ کر دیکھتا، مہروں کو چھوتا، ہات پر رکھ کر اس کے وزن کا اندازہ کرتا اور کبھی کبھی بے اختیارانہ طور پر اس کو چاک کرنے کے لئے کونے پھاڑنے پر آمادہ ہو جاتا۔ لیکن اس خیال سے کہ خط کے آنے کا علم مس گارڈن کو ضرور ہو جائیگا اور چاک کیا ہوا خط دینا ناممکن ہوگا۔ پھر باز آجاتا۔ وہ نہایت شش و پنج میں تھا، اور اس کی خلش جستجو ہر دم بڑھتی جاتی تھی! ٹھیک اسی وقت کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی اور یوسف نے بے اختیاری کے ساتھ خط کو اپنی جیب میں چھپالیا۔ آتے ہی مس گارڈن نے پوچھا کہ "میرا کوئی خط تو نہیں آیا" اور یوسف نے بھی گھبراکر انکار کر دیا۔ مس گارڈن یہ سنتے ہی خط لانے کی غرض سے الٹے پانوں واپس گئی اور قبل اس کے کہ یوسف کچھ کہے یا اُسے روکے وہ جا چکی تھی۔ مس گارڈن کے اس اضطراب نے اور زیادہ اسے متحیر کیا، یہانتک کہ اس کا جذبۂ جستجو حد ضبط سے بڑھ گیا اور اُس نے دروازہ بند کرکے خط کو چاک کرکے پڑھنا شروع کیا۔ خط طویل تھا اس لئے یوسف کو اس کے ختم کرنے میں دیر لگی، لیکن جس وقت وہ اُس کو ختم کر چکا تو اُس کا چہرہ غصہ سے سرخ تھا اور ایسا کرب اس کی ہر ادا سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے بچھونے ڈنک مار دیا ہو۔

تھوڑی دیر تک تامل کرنے کے بعد، اُس نے خادم کو آواز دی اور حکم دیا کہ فوراً اس کے سفر کا مختصر سا سامان درست کردے،

سب سے پہلی ڈاک سے اس کو روانہ ہو جانا ہے۔

جاتے وقت اُس نے ہدایت کی کہ مکان مقفل کر دیا جائے اور اگر مس گارڈن آئیں تو ان سے کہدے، کہ وہ نہایت ضروری کام سے دودن کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔

(۱۰)

جیب کے مسرت کی انتہا نہ تھی کیونکہ مس ہلن نے اُن سے عقد کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور کالج کے ہر حلقہ میں اسی خوش کام اندوزی کا ذکر تھا، جیب یقیناً متمول خاندان کا فرد تھا۔ لیکن یہ کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ وہ عروس کی رونمائی میں بیس ہزار کی رقم دینے کیلئے آمادہ ہو جائیگا۔

مس ہلن نے یہ رقم اپنے حسن و شباب کی قیمت میں نہیں لینا چاہی تھی بلکہ صرف اس لئے کہ وہ اپنی اور جیب کے مواصلت کی یادگار میں ایک زنانہ صنعتی اسکول قائم کرے۔ یہ خیال اس قدر عجیب تھا کہ کالج کے ہر فرد کو دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور ہر شخص ان دونوں کی وسعت نظر و سیر چشمی کی داد دے رہا تھا۔

نکاح کے منجملہ دیگر شرائط کے علاوہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ جیب بیس ہزار روپیہ ایک زنانہ صنعتی اسکول قائم کرنے کے لئے مس ہلن کو دیگا اور رقم کی ادائی کے بعد ایک ہفتہ کے اندر دونوں کا عقد ہو جائے گا۔

شام کا وقت تھا مس ہلن کے علاوہ دوچار پروفیسر جیب کے بنگلہ میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ حسب قرارداد جیب نے بکس سے بینک کی کتاب نکال کر چک پر بیس ہزار کی رقم درج کی اپنے دستخط ثبت کئے اور مس ہلن کی طرف بڑھایا، لیکن ابھی مس ہلن لینے کے لئے جھکی ہی تھیں کہ دفعتہً دروازہ نہایت زور سے کھلا اور یوسف انتہائی بدحواسی کے ساتھ دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور فوراً یوسف کے ہاتھ سے اس نے چک چھین کر اپنی مٹھی میں لے لیا۔

ہر شخص حیران تھا، کہ یہ کیا قصہ ہے، جیب باوجود غیر معمولی سنجیدہ انسان ہونے کے برہم تھا کہ یہ کیا حرکت اس نے کی، یوسف کا چہرہ بالکل دیوانوں کا سا تھا، سر کے بال پریشان تھے اور لباس بے ترتیب اضطراب اور بے چینی اس کی ہر ہر ادا سے ظاہر ہو رہی تھی۔ مس ہلن نے اُس کو دیکھا اور کچھ سہم گئی۔ قبل اس کے کہ یہ منظر کوئی اور صورت اختیار کرے یا کوئی گفتگو شروع ہو، یوسف نے مس ہلن کے ہاتھ سے انکا چھوٹا بیگ ایک جھٹکے کے ساتھ چھین لیا اور اسے کھول کر ایک لفافہ نکالا جس میں کچھ کاغذات ملفوف تھے۔

مس ہلن اب چونکہ سارے معاملہ کو سمجھ چکی تھی اس لئے وہ گھبرا کر اٹھی تاکہ دروازہ کھول کر باہر نکل جائے، لیکن یوسف نے بڑھ کر انکو روک دیا اور بولا کہ "مس ہلن ذرا صبر کیجئے اور اپنا پاسپورٹ اور جہاز کا ٹکٹ تو ساتھ لیجائیے ورنہ پرسوں کی ڈاک کے جہاز میں آپکا جانا ممکن نہ ہوگا"

یہ کہکر اُس نے لفافہ کے اندر سے مس ہلن کا پاسپورٹ اور جہاز کا ٹکٹ نکال کر سب کے سامنے میز پر ڈال دیا اور بولا کہ جیب تم مجھ سے ضرور خفا ہوگے کہ میں نے عین اسی وقت جبکہ جام تمہارے لبوں سے قریب تر ہوگیا تھا چھین کر پھینک دیا، لیکن

باور کرو کہ وہ جام شراب کا نہ تھا بلکہ نہایت قاتل زہر کا تھا" اور یہ کہکر اس نے اپنی جیب سے وہی خط نکالا جو مس ہلن نے مس گارڈن کے نام لکھا تھا اور حبیب کی طرف بڑھا کر کہا کہ " اسے بھی پڑھ لو تاکہ تم سمجھ سکو کہ ہندوستان کے مشہور سیاہ سانپ میں بھی وہ زہر نہیں ہوتا جو یوروپ کی سفید رنگ کی ناگنوں میں پایا جاتا ہے"

خط کا مضمون یہ تھا:-

"مائی ڈیر مس گارڈن"

میں اس لحاظ سے بیشک تمہاری بڑی معترف ہوں کہ تم نے اپنا کام نہایت کامیابی اور ہوشیاری کے ساتھ انجام دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک اصل معاملہ میں مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا مطالبہ ابھی اور باقی ہے۔ خود مسٹر یوسف سے مجھے معلوم ہوا کہ صرف ایک تاریخ میں پانچ ہزار روپیہ تم نے اُن سے حاصل کئے اور اس سے قبل بھی بارہا ہزاروں روپیہ تم نے جیتے کیا میں اس رقم میں برابر کی شریک نہیں ہوں۔ غور کرو کہ شروع سے لیکر اخیر تک، یوسف کے دماغ کی سائکلوجی کا مطالعہ کر کے تدریجی تدبیریں جو میں نے اختیار کیں، کس طرح کامیاب ہوئیں یہانتک کہ میں تمکو اس کو بمبئی کے سہراب جی والے معاملہ سے بھی زیادہ صحیح نشانہ خیال کرتی ہوں، اس وقت تک وقتاً فوقتاً مجھے صرف چار ہزار روپیہ ملے ہیں، لیکن تم خود سمجھ سکتی ہو کہ یہ کس قدر کم ہے

ہر حال مجھے یقین ہے کہ تمہاری نیت درست ہوگی اور کسی خاص وجہ سے تم نے اس طرف توجہ نہ کی ہوگی۔ میں نے مسٹر حبیب کے متعلق تمام واقعات سے اس مرتبہ دارجلنگ کے دوران قیام میں آگاہ کر دیا تھا۔ وقت آگیا ہے کہ اس معاملہ کو بھی ختم کر دوں بیس ہزار کی رقم غالباً ۲۰ کو مجھے مل جائیگی اور علی گڑھ سے یہ رقم وصول کر کے سیدھی بمبئی جاؤنگی۔ ۲۲ کی صبح کو امریکن ہوٹل میں ملو تاکہ باہم ملکر حساب کریں اور حبیب کے معاملہ کا جتنا روپیہ تم کو ملنا چاہئے وہ میں تمہیں دیدوں اور تم سے مجھے جو کچھ لینا ہے وہ لیلوں بالکل تیار ہو کر آنا۔ اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہو تو تار دو تاکہ تمہارے ٹکٹ کا بھی انتظام کروں باقی تفصیلی باتیں ملنے پر ہونگی"

اس واقعہ کے بعد مس ہلن کا ہمیشہ کے لئے ساحل ہند کو خیرباد کہدینا اور مس گارڈن کا لاپتہ ہوجانا بالکل قدرتی نتیجہ تھا، لیکن سب سے زیادہ دلچسپ انقلاب وہ تھا جو یوسف کی زندگی میں پیدا ہوا۔ وہی خلدآباد ہے اور وہی اسکی ہری بھری کھیتیاں، جہاں صبح سے شام تک یوسف دھوپ میں کھڑے ہو کر کام کرتا ہے اور شام کو جب واپس آتا ہے تو گاؤں کے معصوم لڑکیوں کے گیتوں کو سن سن کر اس کی خستگی ایک خاص قسم کی روحانی لذت محسوس کرتی ہے

نیاز

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(سلسل)

دوسری جانب میں نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ قدیم ایام کی خانہ جنگیاں ختم ہوگئی ہیں اور ان کے بجائے امن وامان قائم ہوگیا ہے اور زندگی زیادہ محفوظ ہوگئی ہے میں نے کسی ہندوستانی کو اس فائدہ کی اہمیت کو گھٹاتے نہیں دیکھا اسی طرح وہ ذہنی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی قدر وعافیت کا بھی معترف ہے۔ ذہنی نشوونما کے لئے ایک حد تک سیاسی آزادی لازمی شے ہے۔ جہاں لوگ اظہار خیالات پر جرمانہ، قید یا موت کی سزا پاتے ہوں وہاں خیالات ترقی نہیں پاسکتے اور شخصی آزادی کی کمی نے ہندوستان کو صدیوں تک ذہنی غلامی میں مبتلا رکھا ہے۔ لیکن باوجود تمام نقائص کے انگریزی حکومت کے ماتحت خیالات آزاد رہے ہیں اور جن اشخاص نے غور وفکر کرنے کی جراءت کی ہے انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ایک ایسی نسل تیار ہوگئی ہے جو آزادی رائے کو بہت گراں بہا شے شمار کرتی ہے اور اس کے باعث دو دیر ہوگئی ہے۔ شہروں کے رہنے والے ہندوستانی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، وہ کتابیں تصنیف کرتے ہیں، اخبارات نکالتے ہیں، ——— جلسوں میں شامل ہوتے ہیں، عام تقریریں کرنے کی غرض سے دورے کرتے ہیں، بے خوف ہوکر سوچتے گفتگو کرتے اور بحث ومباحثہ کرتے ہیں اور ان سب کا نتیجہ عام ذہنی اور اخلاقی بیداری ہے۔ مزید برآں یہ معمولی بات نہیں ہے کہ بڑے درجوں کے آدمیوں میں جرائم کی تعداد کم ہوگئی ہے اور قدیم شاہانہ درباروں کی عیاشیاں جاتی رہی ہیں۔ جادو، زہر خورانی، قتل اور بدمعاشی کی زندگیوں میں کمی واقع ہورہی ہے، ستی کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ اور صغر سنی کی شادی کے خلاف جوش وخروش جاری ہے یہ نمایاں فوائد ہیں اور کوئی انگریز یا ہندوستانی ان کی اہمیت کو کم نہیں کرسکتا، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ان میں امید کا عنصر مضمر ہے جو باقی تمام برائیوں کا نجات دہندہ ثابت ہوگا۔

لہذا ہندوستانی محبان وطن کی یہ نادانی ہوگی اگر وہ انگریزی تعلق کو منقطع کرنے کی کوشش کریں گے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ابھی اسے برا بھلا نہیں کہہ رہے ہیں صوبجات بنگال، مدراس اور بمبئی میں مشکل سے کوئی سمجھدار ہندوستانی ہوگا جو انگریزی تاج سے اپنے ملک کی فوری علیحدگی کا خیال دل میں لاتا ہو۔ بیرونی خطرات سے قطع نظر کرکے اندرونی ملک کے خطرات ایسے ہیں جنہیں سب تسلیم کرتے ہیں۔ ہندوستانی ایک قوم نہیں ہیں نہ وہ صرف مذہب کے پیرو ہیں اور نہ وہ ایک زبان ہی بولتے ہیں۔ اس کی سرحد میں ایسے حصص شامل ہیں جو بالکل وحشی ہیں۔ پہاڑی اقوام برچھیوں اور ڈھالوں سے ابھی تک مسلح ہیں اور امن پسند زراعتی آبادی نہایت جاہل ہے۔ تعلیم کا کام ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچا اور نہ حفاظت کی ضرورت کا خاتمہ ہوا ہے اسے سب تسلیم کرتے ہیں اور مسلح امپیریل حکومت کی ضرورت کو سمجھتے ہیں کہ اگر اسے ہٹا لیا جائے تو موجودہ مہذب سیاسی ڈھانچہ قائم نہیں رہ سکتا اور یہ بات مشتبہ ہے کہ آیا کوئی اور نظام اس کی جگہ لے سکتا ہے یا نہیں۔ میں دیکھنے سے قاصر ہوں کہ انقطاع تعلقات ہندوستان کے لئے مفید ہوگا اور سمجھنے سے عاری ہوں کہ انگریزی حکومت کے بجائے کسی اور غیر ملکی حکومت کا قیام انکی حالت کو بہتر بنا دیگا

ساتھ ہی میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ ناممکن ہے کہ موجودہ صورت حالات چند سال سے زیادہ قائم رہ سکے۔ اینگلو انڈین حضرات کے نظام سے ہندوستانی کلیۃً متنفر ہیں مجھے یقین نہیں آتا کہ انگلستان بجز کسی فوجی بغاوت کو فرو کرنے کے قابل ہوسکیگا جسکے ساتھ لازمی طور سے تمام باشندوں کی ہمدردی شامل حال ہوگی۔ لیکن اگر اس بغاوت کے منحوس دن کا التوا بھی ہوجائے تو بھی فوجی طاقت کے ذریعہ جو حکومت کی جائے گی وہ بہت گراں ثابت ہوگی اور عرصہ تک اس کا چلانا ناممکن ہوگا۔ یہ خیال کرنا سخت غلطی ہے کہ ہندوستان پر انگریزی تلوار کے ذریعہ حکومت کیجاتی رہی ہے۔ لوگوں کی رضامندی حکومت کرنے میں ہمیشہ شامل رہی ہے اور اگر عام طور پر ترک موالات عمل میں آجائے تو موجودہ حکومت گھنٹہ بھر بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ فی الحال ہندوستانی انگریزی حکومت کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ ان کے لئے مفید ہے اور اگر انہیں ایک مرتبہ یہ یقین ہوجائے گا کہ انگریز ان سے بہتر سلوک کرنا نہیں چاہتے اور انہیں زیادہ آزادی دینے کے خواہشمند نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ بغاوت کئے بغیر وہ حکومت کو ناممکن بنادیں۔ یہ بات زیادہ زور سے بیان کرنے کے قابل ہے کہ ہمارا نظام حکومت ہندوستانی باشندوں کی مرضی اور موالات پر منحصر ہے۔

آخر عملاً وہ ریفارم کیا ہونی چاہئے اور وہ کون انتہائی منتہائے نظر ہے جسے سیاسیات میں مصلحین کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے جب میں کلکتہ میں تھا تو اس وقت بہت سے جلسوں میں میں نے شرکت کی تھی جہاں ہندوستان کے مختلف حصص کے ڈیلیگیٹ آئے تھے اس لئے میں کم وبیش صحت کے ساتھ ہندوستانی ضروریات

کے متعلق ہندوستانی خیالات کی ترجمانی کرسکتا ہوں۔ یہ بات آسانی بیان کیجاسکتی ہے کہ اگرچہ وہاں سب کے سب اپنی اُمیدوں کے پورا ہونے کا یقین رکھتے تھے لیکن کوئی شخص بھی ان میں ایسا نہ تھا جو یہ خیال کرتا ہو کہ ہندوستانی حکومت کے نظام میں ضروری تبدیلی پیدا کئے بغیر کامیابی ممکن ہے۔ ان کا استدلال حسب ذیل ہے :- اسوقت تک کوئی اصلاح عمل میں نہیں آسکتی جب تک کہ خود گورنمنٹ کی اصلاح نہ ہوجائے یہ انتہا درجہ کی قدامت پسند، خودغرض اور ہندوستانی جذبات وضروریات سے بالکل اجنبی ہے اور جس طرح سے کہ انگلستان کے مصلحین اس صدی کی ابتدا میں پہلے پارلیمنٹ میں اصلاح کرنے کے موید تھے اسی طرح سے ہندوستانی مصلحین بھی پہلے ملک کی حکمران جماعت کی اصلاح کے خواہشمند ہیں ——————— اور ملک کی طاقتور رائے اس امر کی تائید میں ہے کہ ہندوستانی توقعات اور کسی طرح پوری نہیں کی جاسکتیں نہ ہندوستانی مشکلات اور کسی طرح ٹالی نہیں جاسکتیں

موجودہ ہندوستانی نظام اس زمانہ سے ورثہ میں ملا ہے جبکہ حکام کے دل میں یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ اُن کا مطمح نظر ہندوستانیوں کو فائدہ پہنچانا ہے اس نظام کی بانی مبانی ایسٹ انڈیا کمپنی تھی جو ایک غیر ملکی تجارتی کمپنی تھی جو ملک کو اپنا مال قرار دیتی تھی اور جس کا یہ خیال تھا کہ فائدہ خالصۃً اس کے ممبروں کو پہنچے خواہ سود کی شکل میں یا شرکائے کمپنی کے رشتہ داروں اور دوستوں کو ملازمت دینے کی شکل میں ہندوستانیوں کا صرف اتنا خیال رکھاجاتا تھا کہ اُن کی خوشحالی کا اثر کمپنی پر پڑتا تھا اور ابتدا میں تو یہ خیال بھی نہ تھا۔ ہندوستان مالدار ملک تھا اور برسوں تک اسے دولت کی نہ کم ہونے والی کان سمجھاجاتا رہا صرف وارن ہیسٹنگز کے مقدمہ کے بعد متعلقہ اشخاص کی حرص وآز کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ لندن کے ڈائرکٹران اور تینوں صوبوں میں ان کے ملازمین کا مقصد ایک تھا یعنی یہ کہ روپیہ کمانا اور جب کبھی ان کے درمیان اختلاف رائے ہوجاتا تھا تو وہ صرف نفع کی تقسیم کے متعلق ہوا کرتا تھا وہ سب کے سب مالدار بننا چاہتے تھے

بعد ازاں حکومت ڈائرکٹروں کے بورڈ کے سپرد ہوگئی جو انڈیا ہاؤس میں بیٹھکر سول سروس کے ذریعہ انتظام چلاتا تھا اور چونکہ بسا اوقات ڈائرکٹران خود اس کے ممبر رہ چکے تھے اس لئے وہ اس ملازمت کی روایات کو برقرار رکھتے تھے یہ حکمران جماعت غایت درجہ کی استبداد پسند اور ہر قسم کی نگرانی سے مبرا بیوروکریسی تھی جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی اسلئے کہ نہ تو وہ کسی شہنشاہ کی مرضی کے تابع تھی اور نہ رائے عامہ کے روبرو جوابدہ تھی اس کی خودغرضی کو اگر کوئی قوت روکتی تھی تو وہ اس کے بعض ممبروں کی انفرادا نیکی تھی۔ صرف کمپنی کے نئے چارٹر عطا کئے جانے کے موقع پر انگریزی پارلیمنٹ اور پبلک اس امر کی متوقع تھی کہ کسی قسم کی دخل اندازی شاید ممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا ڈھرا غدر تک چلتا رہا +

گر ۱۸۵۸ء میں کمپنی کا بہ حیثیت کمپنی کے خاتمہ ہوگیا۔ ڈائرکٹروں کے بورڈ کو موقوف کردیا گیا اور ہندوستانی سرمایہ پر سود دینا بند ہوگیا اور حکومتِ ہند برائے نام انگریزی تاج کو منتقل کردی گئی۔ اسوقت نظام حکومت کی اصلاح کے بارے میں بہت کچھ شور وغل کیا گیا اور اس امر کا باقاعدہ اعلان بھی ہوگیا کہ آئندہ سے ہندوستان پر ہندوستانیوں کی فائدہ رسانی کی خاطر حکومت کی جائیگی۔ برطانوی ہندوستان کے باشندگان کے نام جو شاہی اعلان شائع ہوا اس میں انگریزی رعایا کی حیثیت سے انکا مساوی درجہ تسلیم کیا گیا۔ سرکاری اعتماد کے فرائض کی ادائیگی میں اُن کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی اور امپریل پالیسی میں بھی یہ طے پاگیا تھا کہ انگریزی فوائد کو ہندوستانی فوائد پر ترجیح نہ دی جائیگی یہ پروگرام نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا کہ اور ہندوستان میں اسکا جوش اور مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا اور انگریزی تاج کے لئے اسوقت جس حقیقی جذبات وفاداری کا اظہار کیا گیا تھا اس میں ابھی تک کمی واقع نہیں ہوئی اس میں صرف یہ نقص رہا ہے کہ اس پر آج تک عملدرآمد نہیں ہوا۔ تمام سرکاری اطلاعات پالیسی کے بیانات اور شاہی اعلانات کے باوجود ہندوستانی حکومت کا اصول وہی ہے جو قدیم سے چلا آرہا ہے یعنی یہ کہ حکومت محض انگریزی تجارت اور انگریزی ملازمین کے فوائد کی حامی ونگراں ہے +

اس عظیم ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ جب طاقت کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر تاج کے ہاتھ میں آگئی تو اسوقت پرانے نظام کو برقرار رکھنا بہت سہل معلوم ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک سول سروس قائم کر رکھی تھی جس میں اسی کے نامزد شدہ اشخاص داخل ہوا کرتے تھے جن کے فوائد رفتہ رفتہ کمپنی کے اغراض ومقاصد میں شامل ہوگئے۔ انہیں ایک خاص معاہدہ کے مطابق مقررہ مدت ملازمت اور بعد میں پنشن کے حقوق عطا کئے گئے۔ ان حقوق کو انگریزی حکومت نے اب تسلیم کرلیا اور ان سے پھر اسی معاہدہ کی تجدید ہوگئی جو انھوں نے پہلے کمپنی سے کر رکھا تھا اور اسی طریقہ سے نظام حکومت میں مخصوص فوائد برقرار رہے جن کے باعث آزاد نشوونما کی راہ میں ہمیشہ سے رکاوٹیں پیش آتی رہی ہیں +

۱۸۵۵ء میں جو حقیقی تبدیلی عمل میں آئی وہ یہ تھی کہ نامزدگی کے بجائے تقرر امتحان پاس کرنے کے بعد کیا جاتا تھا لیکن سروس کی ترکیب جوں کی توں قائم ہے اور موجودہ زمانہ کا انگریز سولین کمپنی کے زمانہ کی طرح اب بھی ہندوستان کا عملی طور پر مالک ہے۔ اس کی موجودہ پوزیشن ایک جماعت کے فرد کی سی ہے یعنی یہ کہ نہ تو اسے برطرف کیا جاسکتا ہے اور نہ اس سے جواب طلب کیا جاسکتا ہے اور نہ وہ اپنے ہم ملکیوں کے علاوہ اور کسی کے اختیار کے

آگے سر تسلیم خم کرسکتا ہے۔ تمام انتظامی اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہی تمام آمدنی کو خرچ کرتا ہے اور وہی تمام ادنیٰ ملازمتوں کا تقرر کرتا ہے۔ در حقیقت یہی خود گورنمنٹ ہے اور گورنمنٹ بھی نہایت مطلق العنان قسم کی +

لیکن یہ سول سروس کلیۃً قدامت پرست ہے۔ اگرچہ وہ ایک وسیع حد تک اعلیٰ اور دیانتدار اشخاص پر مشتمل ہے۔ (اور یہ وہ اشخاص ہیں جو اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہیں اور صرف کبھی کبھی فرض منصبی سے زیادہ بھی کام کر لیتے ہیں) تاہم اس میں وہ تمام خرابیاں موجود ہیں جو اس قسم کی جماعتوں میں ہونی لازمی ہیں۔ وہ پہلے اپنے فائدہ پر نظر رکھتی ہے اور پھر ہندوستانیوں کے مفاد کا خیال کرتی ہے اس امر کا بیان کرنے سے اس کے ممبروں پر کسی قسم کی برائی عائد نہیں ہوتی۔ ابھی تک دنیا میں کوئی ایسی جماعت پیدا نہیں ہوئی جو اپنی جیب کو نقصان پہنچا کر عامۃ الناس کی بھلائی کرنے کی خواہشمند ہو اور انڈین سول سروس جو اس قاعدہ کی مستثنیات میں سے نہیں ہے، یہ دیکھ رہی ہے کہ ریفارم ہوتے ہی اس کی تنخواہ میں کفایت شعاری پیدا ہو جائیگی، اس کے حقوق کم کر دئے جائیں گے اور ملازمت کا میدان محدود ہو جائیگا۔ اس قسم کی ملازمت فطرتاً ہر کفایت شعاری اور ہر تبدیلی کی دشمن ہوا کرتی ہے +

لہٰذا جب میں ہندوستانی مصلحین کے ساتھ ہم نوا ہو کر یہ کہتا ہوں کہ اس سول سروس کی اصلاح کیجائے، تو سب سے پہلے میری اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ رکاوٹ کو ہٹا دیا جائے۔ لیکن سول سروس اب اس پارینہ ہو چکی ہے اور اب ضرورت نہیں ہے کہ اس فضول خرچی کو قائم رکھا جائے۔ ممکن ہے کہ پچیس، چالیس یا پچاس برس پیشتر تک اس امر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہو کہ تعلیم یافتہ انگریزوں کی خدمات نہایت شاندار تنخواہیں دیکر عمر بھر کے لئے اس زمانہ کے ہندوستان جیسے دور دراز ملک کے لئے حاصل کیجائیں۔ ایک نسل پہلے ایسے لوگ کمیاب تھے اور اس لئے ممکن ہے کہ انڈیا ہاؤس (جواب انڈیا آفس کہلاتا ہے) اپنی ضرورتوں کے باعث خاص خاص حقوق دینے اور اعلیٰ درجہ کی تنخواہیں دینے پر مجبور رہو لیکن موجودہ زمانہ نے سب کچھ تبدیل کر دیا ہے اور قابلیت کی بہم رسانی اس قدر زیادہ ہے کہ کسی قسم کا خاص معاہدہ کئے بغیر اچھی سے اچھی شے میسر آسکتی ہے۔ تجارتی کمپنیوں نے اس پرانے خیال کو اب ترک کر دیا ہے اور اب وہ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان کے لئے بھی کھلی منڈی میں اپنے آدمی تلاش کرتی ہیں اور انھیں محض اس وجہ سے گھٹیا مال دستیاب نہیں ہوتا کہ وہ عمر بھر کے پٹے نہیں لکھتیں اور اگر گورنمنٹ آف انڈیا مالی لحاظ سے اپنا سرمایہ پانی کی سطح سے بلند رکھنا چاہتی ہے تو اسے بھی آئندہ زمانہ میں اسی اصول پر عملدرآمد کرنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ مساوی قابلیتوں کے انگریز ½ تنخواہ پر میسر آسکیں گے اور ان کیلئے کسی خاص معاہدہ کی ضرورت پیش نہ آئیگی۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اعلیٰ ترین مدارج کے سوائے باقی تمام انگریزی سروس کا خاتمہ کر دینا بدرجہا بہتر ہوگا اور ان کے بجائے کم شرح کے ہندوستانی اشخاص ملازم رکھے جائیں، جن کے لئے یہ کم شرح بھی بہت ہوگی۔ بہت زیادہ تعداد میں انگریزوں کو ملازم رکھنے کا رجحان حال ہی میں پیدا ہوا ہے اور اس میں ہر طرح کا نقصان ہی نقصان ہے +

لہٰذا سول سروس کے بجائے ایک مخصوص سول سروس رونما ہوگی مگر جسکے ساتھ خاص حقوق شامل ہوں گے۔ اس کے افراد زیر نگرانی ہونگے اور حقیقی معنوں میں ملک کے خدمتگار اور ملازم متصور ہوں گے۔ موجودہ زمانہ میں وہ اس کے آقا بنے ہوئے ہیں +

یہ امر کہ وہ اس کے آقا ہیں، کافی طور پر اُن کوششوں کی کامیابی سے ثابت ہوگیا ہے جو گزشتہ تین سال میں لارڈ رپن کی پالیسی کو ناکام بنانے میں عمل میں آچکی ہیں۔ لارڈ رپن ہندوستان میں ایسے زمانہ میں آئے تھے جبکہ مڈلوتھیں کی فتح[1] حالت شباب میں تھی اور وہ ان خیالات کو عمل میں لانے کے نہایت سرگرم موید تھے جن کا اظہار انھوں نے اپنی تقریر میں کیا تھا۔ اُن کے خیالات میں اگرچہ اَب تک کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی لیکن اُن کے وائسرائے بننے سے خاک فائدہ نہیں پہنچا۔ جو مسودۂ قانون بھی انھوں نے پیش کیا وہ تفصیلات میں پڑکر بالآخر ناکام رہا۔ اور سول سروس اس قدر طاقتور ثابت ہوئی ہے کہ اس نے ہندوستان کے بارے میں آزاد پالیسی کو ترک کر دینے کے لئے انگلستان کی حکومت کو بتدریج مجبور کر دیا۔ جب میں ہندوستان پہونچا تو میں نے لارڈ رپن کو اسکول کے اس طالب علم کی طرح پایا جو اپنے ہمجولیوں کے ساتھ دوڑ میں سب سے آگے بھاگا جا رہا ہے اور اُسے اتنی خبر نہیں کہ اس کے باقی ساتھی رک گئے ہیں۔ اور یہ کہ باقی ساری دنیا اسکی غیر ضروری سرگرمی پر خندہ زن ہو رہی ہے۔ مڈلوتھین کے باوجود اینگلو انڈین بیورو کریسی اپنے تئیں انکا آقا ثابت کر چکی تھی +

لیکن اگر سول سروس مردہ کمپنی کا رکاوٹ پیدا کرنے والا اور تکلیف دہ ورثہ ہے تو لندن میں ہندوستانی گورنمنٹ کے نظام کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئے ۱۸۵۸ء میں جب کمپنی کا خاتمہ ہوا تو انڈیا ہاؤس کے بجائے انڈیا آفس قائم کیا گیا۔ اور بورڈ آف ڈائرکٹرز کے بجائے انڈین کونسل کا وجود ظہور میں آیا

[1] اس سے مراد وہ فتح ہے جو گلیڈ اسٹون کو اسوقت حاصل ہوئی جبکہ انھوں نے مڈلوتھین کے مقام میں اپنی آزاد پالیسی کا اعلان کر کے میجارٹی کو اپنا ہمخیال بنالیا +

اس تبدیلی سے دکھانا بہت کچھ مقصود تھا مگر عملاً کچھ بھی نہیں ہوا۔ انڈیا آفس مجبور ہے کہ پرانی روایات کی نمایندگی کرے اور کونسل جو اسکی کارروائیوں کو روکنے کے لئے بنائی گئی تھی بورڈ آف ڈائرکٹرز سے کہیں زیادہ قدامت پسند اور رکھ رکھاؤ والی واقع ہوئی ہے اس کا سبب بالکل بدیہی ہے۔ کونسل جو کم و بیش پنشن یافتہ سول اور ملیٹری ملازمین پر مشتمل ہوتی ہے صرف اینگلو انڈین سروس کے نقطۂ خیال سے ہندوستانی معاملات پر بحث کرتی ہے۔ وہ جدید خیالات کو قبول کرنے کی جانب مقابلتہً کم مائل ہے اور ہندوستانیوں کے جدید خیالات سے بالکل نابلد ہے۔ وہ تجربہ کے اعتبار سے ایک نسل پیچھے ہی رہتی ہے۔ اسی طرح سے وزیر ہند جو کلیتہً اس اندھے رہنما پر اپنا انحصار رکھتا ہے، انگلستان میں بعینہ وہی حیثیت رکھتا ہے جو وائسرائے کی ہندوستان میں ہے۔ بالعموم وہ ہندوستانی معاملات سے بے خبر رہتا ہے اور انڈیا آفس اور اپنی اینگلو انڈین کونسل سے مشورے طلب کرتا ہے اور اس لئے وہ کبھی سچائی معلوم نہیں کر سکتا یہی سبب ہے کہ انکی رہنمائی میں وہ اندھے پن میں غلطیاں کرجاتا ہے خواہ وہ کتنا طاقتور اور سنجیدہ ہو اس کے لئے ناممکن ہے کہ مصلح کی حیثیت سے ان کے مقابلہ میں قائم رہ سکے +

لہذا جو اصلاحات ہندوستانی باشندے انگلستان اور ہندوستان میں نہایت زور اور اصرار کے ساتھ طلب کر رہے ہیں وہ ہندوستان کے متعلق تو اتنی ہیں کہ سول سروس کے نظام کو بالکل بدل دیا جائے اور عمر بھر کے پٹے اور معاہدے منسوخ کرکے ہندوستانیوں کو آزادانہ طریقہ سے انہیں بغیر کسی معاہدہ کے داخل کیا جائے۔ وہ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ جوں جوں جگہ خالی ہوتی جائیں دوں دوں ہندوستانیوں کے لئے مناسب تعداد محفوظ رکھدی جائے اور اس طرح سے بتدریج سوائے اعلیٰ ترین عہدوں کے باقی سب کے سب ہندوستانی باشندوں سے پر کئے جائیں مزید برآں لندن کی کونسل میں وزیر ہند کو مشورہ دینے کے لئے ہندوستانی اور اینگلو انڈین پنشن یافتہ افسر ہونے چاہئیں انکا خیال ہے کہ جب تک ایسا نہ کیا جائیگا اسوقت تک گورنمنٹ آف انڈیا تاریکی میں رہیگی اور اصلاحات کی سب کوششیں رائیگان ہوجائینگی +

یہ ظاہر ہے کہ ایسے ابتدائی تغیرات زیادہ ضروری اصلاحات کی جانب صرف پہلا قدم ہیں۔ ہندوستانی جس شے کا مطالبہ کرتے ہیں وہ سوراج ہے یعنی یہ کہ نہ صرف انتظامی طاقت ان کے ہاتھ میں دیدیجائے بلکہ یہ کہ قوانین وضع کرنے اور مال کے اختیارات انھیں سونپ دئے جائیں۔ فی الحال ہر صوبہ میں قانون وضع کرنے کا اختیار گورنر باجلاس کونسل کے ہاتھ میں ہے اور پبلک کے نمایندوں کو اس میں شریک کرنے کا کوئی انتظام نہیں کونسلیں کلیتہً نامزد شدہ ممبروں پر مشتمل ہوتی ہیں جن کا کام محض مشورہ دینا ہے۔ کیونکہ وہ کسی چیز کو پیش کرنے یا اسے نامنظور کر دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ ہر کونسل میں چند ہندوستانیوں کو جگہ دیدی گئی ہے مگر وہ کسی اعتبار سے ملک کے نمایندے نہیں کہلائے جاسکتے بلکہ گورنمنٹ کے نامزد شدہ ممبر ہیں اور محض اس لئے منتخب کئے گئے ہیں کہ ان میں گورنر کی ہاں میں ہاں ملانے کی قابلیت موجود ہے۔ باقی تمام ممبر انگریز (سول اور ملیٹری افسر) ہوتے ہیں جو ممبری کو اپنی خدمات کا انعام تصور کرتے ہیں اور جو محض سرکاری خیالات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ لارڈ رپن نے بلاشبہ اپنی سپریم کونسل میں آزاد خیال ہندوستانیوں کو داخل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جو لوگ بالعموم اس عہدے پر مقرر ہوتے ہیں اُن کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی سہ سالہ میعاد کے بعد دوبارہ ممبر مقرر کئے جائیں اس لئے ہندوستانیوں کے جذبات کی نمایندگی کرنے کے بجائے وہ گورنر کی ہمنوائی کرتے ہیں سے

آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

یہ خوشگوار صورتِ حالات نہیں ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ پبلک کی مختلف جماعتوں کو اپنے نمایندے منتخب کرنے کا اختیار دیا جائے اور ان کی توسیع میعاد کا اختیار گورنر کے ہاتھ میں نہو اور جب کونسلروں کی تعداد بڑھ جائیگی اور بحث و مباحثہ کرنے اور سوالات پوچھنے کا میدان وسیع کر دیا جائے گا تو اسوقت اس مطمح نظر کی اچھی خاصی بنیاد پڑجائیگی جسے ہندوستانی صوبہ دار پارلیمنٹ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کم سے کم ابتدائی قسم کی لوکل پارلیمنٹ کی اہلیت نہیں رکھتا بلاشبہ کچھ عرصہ کے لئے کونسلوں میں انگریزی عنصر کی زیادہ مقدار رکھنے کی ضرورت ہوگی لیکن ہندوستانی دماغ بہت جلد باتیں اخذ کرلیتا ہے اور دوسری نسل میں بغیر کسی خطرہ کے قوانین سازی کا سارا کام انہی کے سپرد کیا جا سکتا ہے اور مالیات کی کلی نگرانی بھی انہی کے ہاتھ میں دیجا سکتی ہے +

اس سے یہ مطلب نہ نکالا جائے کہ میں ہندوستان کے لئے امپیریل پارلیمنٹ کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ ہندوستان اسقدر وسیع ملک ہے اور اس میں اس کثرت سے مختلف اقوام آباد ہیں کہ بظاہر یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ ایک ہی جماعت میں ان سب کے نمایندے شریک ہو سکیں۔ ممکن ہے کہ کبھی دور دراز

آئندہ زمانہ میں جاکر اس قسم کی پارلیمنٹ وجود میں آجائے مگر ہم لوگوں کی زندگی میں تو یہ مشکل نظر آتی ہے۔ امپیریل طاقت (بشرطیکہ اسے موثر بنانا منظور ہو) ایک ہی شخص کے ہاتھ میں رہنی چاہئے اور وائسرائے کے اختیارات کو کم و کمزور کرنے کے بجائے میری خواہش ہے کہ، انہیں اور زیادہ طاقتور بنا دیا جائے۔ لیکن صوبوں میں اور تمام صوبہ داری معاملات کے لئے سیلف گورنمنٹ ایک ضروری شے ہے اور موجودہ زمانہ اسے عملی شکل میں دیکھنے کی پوری اہلیت رکھتا ہے +

ہندوستان کی سب سے اہم اور فوری ضرورت کفایت شعاری ہے اور اس کے لئے مالیات کی لامرکزیت بہترین علاج ہے ہر صوبہ کا اپنا بجٹ علحدہ ہونا چاہئے اور اپنی سول لسٹ بھی جسپر سالانہ کونسل کی رائے لی جانا چاہئے۔ اسکی سول سروس اپنی علحدہ ہونی چاہئے اور تعمیرات عامہ کا محکمہ بھی اسی کا ہونا چاہئے جسمیں کلکتہ کی جانب سے کسی قسم کی دخل اندازی نہ ہونی چاہئے۔ پراونشل اور امپیریل حسابات بھی علحدہ علحدہ رکھنے چاہئیں۔ موجودہ صورت میں جبکہ مختلف قسم کی امپیریل ملازمتیں رواج پاگئی ہیں اور جنکا صدر مقام کلکتہ یا شملہ ہے۔ روپیہ کا ضائع ہونا مناسب طریقہ سے نہیں رک سکتا حسابات خلط ملط رہتے ہیں اور وہ لوگ جنپر ٹیکس کا بار پڑتا ہے کسی قسم کی نگرانی نہیں رکھ سکتے اور کوئی شخص ٹھیک طور سے یہ نہیں سمجھ سکتا کہ عام بجٹ میں جو اخراجات دکھائے جاتے ہیں وہ کہاں کہاں خرچ کئے جائیں گے۔ لیکن اگر حسابات صوبہ داری ہوں اور مقامی اسمبلی کی جانچ پڑتال کے لئے کھلے ہوں تو موجودہ خرابیوں میں سے ایک بھی باقی نہیں رہیگی کلکتہ کے محکموں کے افسران خواہ نیت کے کتنے ہی اچھے ہوں، وہ مدراس یا پنجاب کے اخراجات کی تفصیل سے واقف نہیں ہوسکتے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بے انتہا روپیہ ہر جگہ ضائع ہو رہا ہے اور غبن بھی کیا جارہا ہے +

میری خواہش یہ ہے کہ جہاں تک سول معاملات کا تعلق ہے ہر صوبہ کا اپنا علحدہ انتظام ہو، ذرائع آمدنی بھی اپنے طور پر بڑھائے، امن عامہ کی ضروریات کو پورا کرے، اور صوبہ داری کونسل کا انتظام و نگرانی کرے۔ بعض صوبوں میں خالصتہ ہندوستانیوں کو ملازم رکھنے سے ابتداہی سے کفایت ہوجائیگی، دوسرے صوبوں میں انگریزی ملازمین کے بجائے ہندوستانیوں کا تقرر بلاشبہ بتدریج عمل میں آئیگا ان صوبوں میں غیر ضروری اخراجات کو کم کرنے کی تحریک یہ دیکھکر خود پیدا ہوگی کہ اخراجات کا بار براہ راست صوبہ پر پڑ رہا ہے۔

برخلاف اس کے یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان جب تک انگلستان کی زیر نگرانی ہے، مال اور انتظام اور وضع قوانین کے بعض فرائض امپیریل رہینگے جو حسب ذیل ہوں گے :-

(۱) فوج اور بیڑے کے متعلقہ اخراجات اور ذمہ داریاں (۲) سیاسی تعلقات۔ (۳) عام قرضہ اور (۴) محاصل بحری۔

فوج کے متعلق جو اخراجات کئے جائیں وہ بلاشبہ امپیریل ہی رہنے چاہئیں اس لئے کہ اگرچہ جنوبی ہندوستان کو اپنی سرحدات کے اندر امن قائم کرنے کی غرض سے افواج کی بہت کم ضرورت ہے، تاہم شمالی ہندوستان کی طرح وہ ہر بیرونی حملہ سے محفوظ ہے اور اُس کی ذمہ دار صرف فوج ہی ہوسکتی ہے، لہذا اس کے اخراجات کا بار اسپر بھی مساوی پڑنا چاہئے صوبہ داری افواج کا نظام کفایت شعاری کے لحاظ سے سخت غلطی ہوگی اور اُن صوبجات پر بڑا ظلم ہوگا جو سرحد پر واقع ہیں۔ کفایت شعاری کی غلطی تو یہ ہے کہ جو اقوام کم جنگجو ہیں وہ مساوی تنخواہ حاصل کرکے ادنیٰ درجہ کے سپاہی مہیا کریں گی جو سلطنت کی عام طاقت کے لئے مضرت رساں ہوگا۔ بے انصافی یوں کہ شمال مغربی صوبجات ہی پر حفاظت کا تمام بوجھ آکر پڑجائے گا۔ لہذا جس طرح سے میں تمام سول معاملات میں نہایت زور شور سے لامرکزیت کے اصول کی حمایت کر رہا ہوں اسی شدومد سے میں فوجی معاملات میں مرکزیت کا موید ہوں امپیریل فوج میرے خیالات کے مطابق وائسرائے کے ماتحت ہونی چاہئے اس کے افسر انگریز ہوں اور سپاہی بہترین قسم ہوں جو ہندوستان میں دستیاب ہوسکتے ہوں اور فوج بھرتی کرتے وقت کسی کی رو رعایت نہ کی جائے۔

ظاہر ہے کہ فوج کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ نہایت ہشیار اور اپنے فن میں ماہر ہو اور یہ کہ اس میں سیاسی تعصبات کو دخل نہ ہو اور ان دونوں وجوہ سے میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستانی افسروں کے مقابلہ میں انگریز فوجی اعتبار سے ہندوستانیوں کے بہتر ملازم بن سکینگے۔ اگرچہ سول معاملات میں ہندوستانیوں کی قابلیت کا بہت مداح ہوں تاہم میں اسی واقعہ کو تسلیم کرتا ہوں کہ انگریز فوج کے بہترین کمانڈر بن سکتے ہیں اور یہ کہ وہ اسی نسبت سے اپنی

اعلیٰ تنخواہ کے مستحق ہیں اور چونکہ دیسی افسروں کے برعکس مذہبی یا ذات پات کے اثرات سے بالکل بری ہوں گے اس لئے وہ امپریل احکام کو غیر جانبدار طریقہ سے عمل میں لا سکیں گے ہندوستانی فوج کو میں اسی معنی میں امپریل اور انگریزی دیکھنا چاہتا ہوں جس معنی میں میں سول ملازمتوں کو پراونشل اور ہندوستانی دیکھنے کا خواہشمند ہوں۔ یہاں پر میں صرف اپنی ذاتی رائے کو بیان کر رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ ہندوستانی رائے دیسی فوجی ملازمت کی تائید میں ہے لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا جب ہندوستان ایک قوم ہو جائیگا تو اس وقت قومی فوج کے قیام کے متعلق غور و خوض کرنے کا بہت وقت ملیگا ۔

مزید برآں سیاسی تعلقات ہر لحاظ سے امپریل ہی رہنی چاہئیں اور ان کا انتظام خاص وائسرائے کے ہاتھ میں ہونا چاہئے جس طریقہ سے آج کل ہندوستانی ڈپلومیسی کا انتظام کیا جاتا ہے وہ پیچیدہ اور گراں ہے لیکن مستقبل کے ہندوستان میں ہمیں اُمید ہے کہ اسے آسان بنانے کی کوشش کیجائیگی۔ دو اہم امور غور کرنے کے قابل ہیں:- ایک تو یہ کہ غیر ملکی سازشوں اور لڑائیوں سے کلیتہً علحدگی برتی جائے اور دوسرے یہ کہ خود مختار ہندوستانی والیان ریاست پر پورا پورا اعتماد کیا جائے۔ غیر ملکی لڑائیوں کا ہندوستان کو کافی تجربہ ہو چکا ہے اور مزید تجربہ کی اُسے ضرورت نہیں۔ چین، ایران، افغانستان، ابی سینا، مصر اور اب سوڈان، ان سب ملکوں کی لڑائیوں میں ہندوستان اپنے مفاد اور اپنی رضامندی کے خلاف شریک ہونے پر مجبور کیا گیا ہے۔ روپیہ کے نقصان کے علاوہ ان لڑائیوں میں قومی وقار کو بھی صدمہ پہنچا ہے جسے ہندوستانی غصہ کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ جو لوگ یورپ کے شریفانہ علم ادب سے واقف ہیں وہ اس امر کو باعثِ ہتک خیال کرتے ہیں کہ خود مفتوح ہو کر وہ دوسری اقوام کو مغلوب کرنے کا ذریعہ بنیں ہندوستان کا بدقسمت مصریوں سے کیا جھگڑا تھا؟ اس کا بدقسمت عربوں سے کیا تنازعہ تھا؟ تعلیم یافتہ ہندوستانی اسے بھی ناراضگی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس سے خرچہ جنگ وصول کیا جائے یہ امور کسی مزید تشریح کے محتاج نہیں۔ یہ اس مطلق العنانہ خود غرضی کا جزو ہیں جو ہندوستان کے ساتھ ہمارے گزشتہ تعلقات کی بنیاد رہی ہے اور ہندوستان کے جدید جنم میں یہ سب باتیں تبدیل کر دینی چاہئیں۔ ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ جو تعلقات رہے ہیں ان میں ہوکہ اور زیادتی کو بڑا دخل رہا ہے مستقبل کی پالیسی میں زیادتی کا خیال مطلق چھوڑ دینا چاہئے۔ ہندوستانی ریاستوں کی جانب صرف ایک پالیسی ہی سچی کہلائی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُن کے روبرو برطانوی ہندوستان کو ان کے باشندوں سے زیادہ خوشحال بنا کر پیش کیا جائے۔ کیا کوئی شخص شبہ کر سکتا ہے کہ اگر ہندوستان میں سلف گورنمنٹ قائم ہو، وہ زیادہ خوشحال اور قانع نظر آئے، تو قدیم دیسی ریاستیں ایک ایک کرکے اسمیں جذب نہ ہو جائینگی؟

قرضہ کے متعلق یہ ہے کہ اگرچہ ہمیں افسوس ہے کہ اسے کیوں لیا گیا، تاہم اس کا بار امپریل گورنمنٹ پر ہی پڑنا چاہئے۔ جنگ کے خرچہ کی طرح اس کے سالانہ سود کو صوبوں پر ان کی مالی حالت کے اعتبار سے تقسیم کر دینا چاہئے سوائے اس حصہ کے جس کا تعلق ریلوں کی ضمانت سے ہے جن کا بار بھی متعلقہ صوبجات کو اُٹھانا چاہئے۔ بہر حال آئندہ کے لئے یہ پالیسی اختیار کر لینی چاہئے کہ مزید قرضہ نہیں لیا جائیگا اور امپریل کاموں کے لئے مزید ضمانتیں نہیں دی جائینگی۔ آئندہ سے رسل و رسایل آبپاشی اور تزئین و ترقی کے کل کاموں کا بوجھ صوبوں پر پڑنا چاہئے جن کے فوائد کی وہ بہت زیادہ قدر کریں گے ۔

باقی رہا محاصل بحری کا سوال تو اسے بھی امپریل ہی رکھنا بہتر ہے اور یہ توقع رکھنی چاہئے کہ جب ہندوستان کی حکومت کے سلسلہ میں ہندوستان کے فائدہ (انگلستان کے فائدہ کا نہیں) کا خیال کیا جائیگا تو اس وقت امپریل اخراجات کو پورا کرنے کی غرض سے اسے فائدہ بخش مد بنا دیا جائیگا۔ ہندوستان کے لئے آزاد تجارت باعث برکت ثابت نہیں ہوئی اور سال درآمد پر محاصل لگانے کا اصول اعلیٰ مالیات کا اصول اولین ہے جسکے لئے خود اختیاری حکومت رکھنے والا ہندوستان سخت اصرار کریگا۔ ہماری اکثر نو آبادیاں اپنا فائدہ اسی میں دیکھتی ہیں۔ اور ہندوستان بھی ایسا ہی کریگا تا وقتیکہ معقول معاوضہ نہ دیا جائے۔ موجودہ صورتِ حالات یہ ہے کہ سارا فائدہ انگلستان کا ہے اور ہندوستان کو سراسر نقصان پہنچ رہا ہے ۔

ہندوستان کو سوراج دینے کے متعلق یہ میری مختصر اور ناقص اسکیم ہے۔ یہ ناممکن الحصول نہیں ہے اور جن لوگوں نے انگلستان کے ایکسٹریمِ

ملک کی حیرت انگیز کامیابی کا مشاہدہ کیا ہے وہ اس کے امکان کے بارے میں شک و شبہ نہ رکھیں گے۔ آسٹریا کی سلطنت (موجودہ نسل کے آدمیوں کو یاد ہوگا) نہایت سخت قسم کی مطلق العنان حکومت تھی اور اسے باشندوں سے کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی اس کے حدود میں نصف درجن کے قریب مختلف اقوام آباد تھیں جنھیں زبان یا نسل کے روابط موجود نہ تھے اور اگر کوئی چیز اُن میں مشترک پائی جاتی تھی تو وہ ظلم کرنے والوں کے خلاف جذبۂ حقارت تھا۔ ۱۸۴۸ء کا آسٹروی افسر سرکشی و تمکنت کا مترادف سمجھا جاتا تھا اور اگرچہ وہ اپنے طریقۂ حکومت کے خلاف دنیا میں بہت کچھ شیخی بگھارا کرتا تھا تاہم وہ سلطنت کے خلاف ایک وسیع بغاوت کا راستہ تیار کر رہا تھا۔ جو لوگ اس زمانہ کی تاریخ کا مشاہدہ کر رہے تھے اُنمیں سے بہت کم ایسے تھے جو یقین کرتے تھے کہ آسٹروی حکومت تباہی کے قریب آگئی ہے اور کسی کو بھی اتنا یقین نہ آتا تھا کہ کبھی اس کے باشندے اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کریں گے۔ لیکن ہمنے اس واقعہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا ہے۔ ہمنے دیکھ لیا ہے کہ اہل ہنگری بالآخر ان سے شیر و شکر ہو گئے اور نیز پول جو حالت مایوسی میں اپنی تباہی پر ۵۰ سال تک آسٹریا کو یورپ بھر میں مطعون کرتے پھرتے تھے۔ اگر سیلف گورنمنٹ کے عطیہ سے یہ امر ممکن ہے تو تمام باتیں ممکن ہو سکتی ہیں اور ہندوستان بھی اسی دیانتدارانہ حکومت کے ذریعہ (جسمیں صوبہ داری سیلف گورنمنٹ شامل ہے) آسٹروی اقوام کی طرح تابع اور شکر گزار بنایا جا سکتا ہے۔ بغیر کسی فوجی طاقت کے ایک اصول جس نے انہیں متحد کر رکھا ہے یہ ہے کہ وہ شاہی تاج کے وفادار ہیں اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی اقوام ہز مجسٹی ملکہ معظمہ سے گہری ذاتی عقیدت اور عمیق جذبۂ وفاداری رکھتی ہیں اور جوں جوں وہ اینگلو انڈین اقتدار سے دور ہٹتی جاتی ہیں دن بدن وہ زیادہ امید کے ساتھ انگلستان کی جانب اور انگریزی تخت پر بیٹھنے والے کی جانب دیکھ رہی ہیں۔ یہ جذبہ نہایت بیش قیمت ہے اور اب بھی ہندوستانی سلطنت کی اس کے ذریعہ نجات عمل میں آسکتی ہے باوجود اس کے اینگلو انڈین حضرات نے اسے بہت کچھ ٹھیس لگا دی ہے۔ میں مستقبل کے لئے اسے رشتۂ اتحاد تصور کرتا ہوں کیونکہ ہندوستان پر قبضہ رکھنے کا ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ جذبۂ وفاداری ہماری خوش قسمتوں کے شریک کے طور پر ہندوستان کو ہم سے متحد رکھیگا۔ ہندوستان اس وقت انگلستان کے ہاتھ سے جاتا رہیگا بلکہ وہ موجودہ حالت سے بڑھ کر ہماری شان و شوکت کا باعث بنیگا۔ اس لئے کہ وہ اس اہم کام کی یادگار ہوگا جو نہ صرف ہم اپنے فائدہ کے بلکہ دوسروں کی فائدہ رسانی کیلئے انجام دے چکے ہیں +

میں اس موضوع پر زیادہ بحث کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں ان خطرات سے واقف ہوں جو سیاسی دنیا میں ہر نئی چیز کے جنم لینے پر رونما ہوتے ہیں اور میں مخصوص فوائد رکھنے والوں کے بیجا غصہ سے بھی واقف ہوں۔ اینگلو انڈین حضرات کے مفاد سختی کے ساتھ ہماری راہ میں حائل ہیں اور نیز روز افزوں ہوس کی تجارت اور بے رحم مالیات بھی رکاوٹ پیش کر رہی ہیں کیونکہ وہ موجودہ حالت میں صرف اپنا نفع دیکھ رہی ہیں۔ ہندوستان کو امن حیات دینے سے بیشتر مانچسٹر کی جوع البقر کو مطمئن کرنا چاہئے اور ہندوستان کی شاہ خرچیاں یکایک بند کر دینے سے شمالی انگلستان کے بہت سے شہروں کی تجارت کو نقصان پہنچ جائیگا۔ ہندوستان کے قرض کے معنی یہ ہیں کہ لمبارڈ اسٹریٹ میں منافع تقسیم ہوں اور اس لئے میں اُمید باندھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ میں ان مایوس کن مگر سچے الفاظ کو دہرا دینا چاہتا ہوں جو جنرل گارڈن نے ہندوستان میں اصلاحات کے مستقبل کے متعلق مجھ سے بیان کئے تھے یعنی یہ کہ "تمہارا جو جی چاہے کرو اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہندوستان میں کبھی اصلاح نہ ہوگی جبتک کہ وہاں نئی بغاوت رونما نہ ہوگی" لیکن سوال یہ ہے کہ وہ بغاوت کس قسم کی ہوگی اور یہ کہ آیا اس کے بعد ہم میں اصلاح کرنے کی گنجائش کہاں تک باقی رہیگی؛

نوٹ:- قارئین کو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ باب اور اس سے قبل کے تین باب پورے ۵۰ سال بیشتر تحریر کئے گئے تھے اس وقت سیلف گورنمنٹ کی اسکیم کا یہ کہکر مذاق اڑایا گیا تھا کہ وہ محض خیالی ہے اور عمل میں آنے کے قابل نہیں ہے لیکن ایشیائی دنیا آگے بڑھ رہی ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز اسکی سفارش کے مفاد کو ضروری خیال کرنے لگ گئے ہیں میں پیشین گوئی کرنے سے احتراز کرتا ہوں کہ آیا افسر نے اصلاحات کی جو اسکیم اس قدر تاخیر کے بعد بادل ناخواستہ پیش کی ہے اس سے ان تلخ جذبات کا خاتمہ ہو سکیگا یا نہیں جو لارڈ رپن کے زمانہ سے لیکر گذشتہ نسل تک ہماری خراب پالیسی سے پیدا ہوتے رہے ہیں غیر ملکی حکومت کی یہ مشترکہ لعنت رہی ہے کہ اصلاحات کا نفاذ ہمیشہ دیر سے کیا جاتا ہے اور ایک شے ایسے وقت پیش کی جاتی ہے جبکہ اسکی ضرورت باقی نہیں رہتی میں رائے زنی کرنا نہیں چاہتا صرف اس قدر کہنے پر کفایت کرتا ہوں ۱۸۸۴ء میں میں نے ہندوستان کی جو حالت اسکے بہترین اور نہایت عقلمند وائسرائے کے زمانہ میں مشاہدہ کی اسکی پوری تصویر میں نے ان اوراق میں پیش کر دی ہے +
ض۔ا۔ب۔ بی اے

روپیہ کی شرح مبادلہ

سے کس قسم کی دشواریاں پیش آسکتی ہیں؟

قبل اس کے کہ ہم روپیہ کی شرح مبادلہ کے گھٹنے اور بڑھنے کی دشواریوں پر غور کریں ہم کو زر وضعی (Token money) کے مقام گداخت کو سمجھ لینا چاہئے۔ زر کی دو قسمیں ہیں (۱) زر مستند (Standard money) اور (۲) زر وضعی۔ زر مستند وہ ہے جس کی قدر ذاتی (Intrinsic value) قدر قانونی (Legal value) کے برابر ہو۔ چونکہ زر مستند کی قدر فلزائی (metallic value) قدر قانونی کے برابر ہوتی ہے اس لئے اسکی تسکیک (coinage) آزاد رکھی جاتی ہے اور ہر شخص اپنی چاندی یا سونا دیکر اجرت ادا کرنے کے بعد ایسے سکے ڈھلوا سکتا ہے۔ زر وضعی وہ ہے جس کی قدر فلزائی قدر قانونی سے کم ہو۔ ایسے سکے جن کی قدر فلزائی قدر قانونی سے کم ہوتی ہے اس کی تسکیک محدود رکھی جاتی ہے اور ایسی تسکیک کا حق حکومت اپنے لئے مخصوص کر لیتی ہے۔

جسطرح تمام چیزوں کی قیمت قانونِ طلب و رسد (Laws of supply and demand) سے قرار پاتی ہے اسی طرح زر وضعی کی قدر قانونی زر مستند کے حوالے سے اس طرح کی جاتی ہے کہ زر مستند کی قدر فلزائی زر وضعی کی قدر فلزائی سے بڑھی رہے مثلاً آج سے چند صدی قبل آٹھ دس تولہ چاندی میں ایک تولہ سونا ملتا تھا جب چاندی ارزان ہوئی تو پندرہ سولہ تولہ چاندی میں ایک تولہ سونا ملنے لگا چاندی کی ارزانی روز بروز بڑھتی گئی اور جنگ عظیم کے قبل تو تیس بتیس تولہ چاندی میں ایک تولہ سونا ملتا تھا اور یہی انکا بازاری نرخ تھا کاروبار کی سہولت کے لحاظ سے بازاری نرخ کو پیش نظر رکھکر اول ساورن کے پنس بنا لیتے ہیں اور ایک اونس چاندی لیکر حساب لگا لیتے ہیں کہ جب ایک تولہ سونے میں اتنی چاندی آتی ہے تو ایک اونس چاندی کتنے پنس کی ہوگی۔

چونکہ آج کل ایک ساورن ۱۵؍ کے برابر قرار دیا گیا ہے اس لحاظ سے ایک اونس چاندی کی قیمت تینتالیس پنس ہوتی ہے اور ایک روپیہ کی قدر فلزائی سولہ پنس کے برابر ہوتی ہے۔ چونکہ ایک روپیہ کی قدر قانونی سولہ پنس کے برابر ہے اس لئے اگر چاندی کی قیمت فی اونس تینتالیس پنس ہو تو روپیہ زر مستند بن جائے گا۔ جب چاندی کی وہ قیمت جسپر سکے کی قدر فلزائی قدر قانونی کے برابر ہو جائے اصطلاحاً مقام گداخت کہلاتی ہے۔ کیونکہ جب سکے کی قدر قانونی کم ہو اور قدر فلزائی زیادہ تو لوگ اسکو گلا کر بطور دھات بیچنے لگیں گے اس لئے قدر قانونی سے قدر فلزائی نہیں بڑھ سکتی۔

چاندی کی قیمت گرنے کا اثر۔ اب ہم کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ روپیہ کی شرح مبادلہ گھٹنے یا بڑھنے سے کسی قسم کی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر روپیہ کی قدر فلزائی قدر قانونی سے کم رہے تو وہ زر وضعی کے طور پر چلتا رہے گا اب اگر چاندی کی قیمت تینتالیس پنس فی اونس

ے گرجائے تو روپیہ کی تسکیک سے سرکار کو بہت فائدہ ہوگا جس طرح سے کہ آج کل بھی سرکار ہند کو روپیہ کی تسکیک سے منافع ہو رہا ہے جس کی مقدار اس وقت تک قریب بیس کروڑ پونڈ کے پہونچ گئی ہے اور جو انگلستان میں جمع ہے۔ اگر چاندی کی قیمت بہت زیادہ گرجائے تو روپیہ حد درجہ کا زر وضعی بن جائے گا، ایسی صورت میں اول تو لوگ مصنوعی سکے بناکر چلانے کی کوشش کریں گے اور دوسرے مبادلات خارجہ میں حد درجہ دقت لاحق ہوگی کیونکہ دوسرے ممالک اپنے مال کے عوض چاندی کی جگہ صرف سونا لیتے ہیں اور وہ قدر فلزائی کا حساب لگاتے ہیں۔ کیونکہ کسی جگہ کی قدر قانونی سے اُن کو کیا بحث اور چونکہ روپیہ کی قدر فلزائی کم ہے اور قدر قانونی زیادہ اس لئے جب ہندوستان کو دیگر ممالک میں سونے کی شکل میں رقم ادا کرنی پڑتی ہے تو اس فرق قیمت کی وجہ سے بہت نقصان ہوتا ہے اور حکومت بھی روپیہ کے عوض سادرن دینے سے عاجز آجاتی ہے ایسی حالت میں مبادلات خارجہ کا سنبھالنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ کئی بار ایسی صورت خود ہندوستان کو پیش آچکی ہے

چاندی کی گرانی کا اثر

دوسری طرف اگر چاندی گراں ہونی شروع ہو اور ۴۳ پنس فی اونس سے بڑھ جائے تو سکے کا سکے کی صورت میں باقی رہنا محال ہے کیونکہ جب سکے کی قدر ذاتی اس کی قدر قانونی سے بڑھ جائے گی تو لوگ اس کو گلا کر بطور دھات استعمال کرنے لگیں گے ایسی صورت میں حکومت کو بہت دقت پیش آتی ہے ادھر تو لوگ سکے گلانا شروع کر دیتے ہیں اور دوسری طرف روپیہ کی مانگ شروع ہوجاتی ہے۔ چاندی گراں ہونے کی صورت میں سولہ آنے میں روپیہ مہیا کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ چنانچہ دوران جنگ میں یہی ہوا چاندی کی قیمت بہت بڑھ گئی اور روپے گلنا شروع ہوگئے لہذا مجبوراً حکومت نے بھی قدر قانونی بڑھانی شروع کی جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ قدر ذاتی قدر قانونی سے کم رہے تاکہ سکے گلنے نہ پائیں اگر اس زمانہ میں امریکہ مدد نہ کرتا اور وہاں سے چاندی نہ ملتی تو ہندوستان کی حالت کو سنبھالنا سخت مشکل ہوجاتا۔

مطالبات وطن

ان دقتوں کے علاوہ چند اور دقتیں ہیں۔ اگر ہم مبادلات خارجہ کو تین حصوں میں تقسیم کریں تو ہر ایک کی حالت جداگانہ نظر آئے گی۔ اس کا ایک حصہ وہ ہے جو حکومت ہند سے متعلق ہے حکومت ہند کو اپنا ایک حساب انگلستان میں وزیر ہند کے پاس رکھنا پڑتا ہے۔ ہر سال انگلستان میں حکومت کے لئے بہت سا سامان مثل صادر و مشنری کے خریدا جاتا ہے اس کے علاوہ جو حکومت ہند کے وظیفہ یاب انگریز وہاں رہتے ہیں ان کو وظیفہ دیا جاتا ہے اعلیٰ کمشنر ہند (High commnr for India) کی تنخواہ حکومت ہند کو انگلستان میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ غرض اس طرح ہر سال ایک بڑی رقم ہندوستان۔ انگلستان کو ادا کرتا ہے جس کو مطالبات وطن (Home charges) کہا جاتا ہے جوں جوں ہندوستان و انگلستان کے تعلقات بڑھتے جا رہے ہیں اس مطالبہ میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ فرض کیجئے کہ مطالبات وطن ہر سال دو کروڑ پونڈ ادا کئے جاتے ہیں اب اگر پونڈ کی شرح مبادلہ دس روپیہ ہو تو بیس کروڑ روپیہ مطالبات وطن کے لئے بجٹ (Budget) میں رکھنا پڑے گا۔ اگر شرح مبادلہ بجائے دس کے پندرہ ہوجائے تو اب بجائے بیس کروڑ کے تیس کروڑ ادا کرنے پڑیں گے۔ اگرچہ مطالبات وطن کی رقم (دو کروڑ پونڈ) میں کچھ اضافہ نہیں ہوا اگر صرف شرح مبادلہ کے گھٹ جانے سے ہندوستان کو دس کروڑ روپیہ کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ اب اگر اس رقم کو سرکار پبلک سے وصول کرے تو وہ بہت زیر بار ہوں گے اگر اپنے پاس سے دے جب بھی دوسرے

مدات میں سے کم کرنا پڑے گا - غرض ہر صورت میں ملک کا نقصان ہے - چونکہ سرکار جو ٹیکس وصول کرتی ہے وہ روپیہ کی صورت میں اور مطالبات وطن پونڈ میں ادا کرنے پڑتے ہیں لہذا مبادلہ کی ضرورت پیش آئی - اسی طرح سرکار ہند کے قرضوں کی بھی دو صورتیں ہیں انگلستان میں جو قرض لیا جاتا ہے وہ بطور طلا اور ہندوستان میں بشکل روپیہ - لہذا انگلستان کو سود بھی پونڈ میں ادا کرنا پڑتا ہے، اور یہ سود بھی مطالبات وطن کا ایک جزو ہیں -

ملازمت

یہی حال بیرونی ملازموں کا ہے اگر انگلستان کا کوئی شخص کسی عہدے پر ہندوستان بلایا جائے تو وہ پہلے دیکھے گا کہ اسکو انگلستان میں کتنا مل سکتا ہے فرض کیجئے کہ اس کو وہاں ایکہزار پونڈ سالانہ ملے گا اب چونکہ وہ وطن چھوڑ کر آئے گا لہذا ضرور ایکہزار پونڈ سے زیادہ طلب کریگا - فرض کیجئے کہ وہ پچاس پونڈ سالانہ زیادہ مانگے اس طرح کل ایکہزار پچاس پونڈ سالانہ ہندوستان اس کو دیگا - اگر شرح مبادلہ دس روپیہ ہے تو اُس کو دس ہزار ڈھائی سو روپئے دینے پڑیں گے اگر شرح پندرہ ہو جائے تو اسکو پندرہ ہزار ساڑھے سات سو ادا کرنے پڑیں گے - گو اُس کو ایکہزار پچاس پونڈ ہی ملے مگر دینے والا کو شرح مبادلہ کی کمی کیوجہ سے پانچ ہزار کا نقصان ہو گیا -

اصل

اگر کاروبار کو دیکھیں تو اسمیں بھی یہی مشکل نظر آئے گی - بعض ممالک ایسے ہیں جن کو اصل خود ملک کے اندر ہی مل جاتا ہے مثلاً امریکہ یا انگلستان لیکن بعض ممالک ایسے ہیں جنکو دوسروں سے قرض لینا پڑتا ہے - مثلاً ہندوستان یا جاپان جب باہر کے لوگ اپنا اصل کسی ملک میں بھیجتے ہیں تو وہ دو باتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں اول یہ کہ جب وہ چاہیں اپنا اصل اسی صورت میں واپس لے سکیں لہذا وہ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ جہاں وہ اصل لگا رہے ہیں وہاں امن وامان قابل اطمینان ہے یا نہیں - مزید اطمینان کے لئے وہ حکومت کی ضمانت بھی چاہتے ہیں - اور اکثر اوقات حکومت کو ضمانت بھی دینی پڑتی ہے جیسا کہ خود ہندوستان میں سرکار نے ریلوے کے لئے ضمانت دی تھی - اور بنکوں کا حصہ دار بننا پڑا - دوسرے یہ کہ اُن کا اصل محفوظ رہے اور اُسمیں کمی نہ ہو اب فرض کیجئے کہ لندن میں کوئی کمپنی دس ہزار پونڈ کے سرمایہ سے ہندوستان کے لئے قائم ہو اگر شرح مبادلہ اُسوقت دس ہوگی تو گویا ہندوستان میں ایک لاکھ کے سرمایہ سے کمپنی قائم ہوئی - لیکن اگر شرح مبادلہ پندرہ ہو جائے تو گویا ہندوستان میں سرمایہ ایک ہی لاکھ رہیگا مگر جب اس کمپنی کے حصص بکیں گے تو ساڑھے سات سو پونڈ ہی میں گے - ایسی صورت میں اگر کوئی دوسری کمپنی ہندوستان کے لئے انگلستان میں ایک لاکھ کے سرمایہ سے قائم ہو تو اُس کو ۶۶۶ سو پونڈ میں ایک لاکھ کا سرمایہ مہیا ہو جائے گا - اور جب یہ نئی کمپنی ہندوستان آکر پہلی کمپنی سے مقابلہ کرے گی تو یقیناً پہلی کو ہار ہوگی کیونکہ پہلی اتنا سستا مال فروخت نہیں کر سکتی جتنا کہ دوسری اگر چیزوں کی قیمت برابر بھی رہے تو پہلی کمپنی کے حصہ داروں کو دوسری کے مقابلہ میں صرف ⅔ منافع ملیگا کیونکہ پہلی کا منافع ایکہزار پونڈ پر تقسیم ہوگا - تو دوسرے کا ساڑھے سات سو پر - اگرچہ ہندوستان میں اس سے نہ کچھ فائدہ نظر آئے گا اور نہ نقصان مگر ان کمپنیوں کو اس مبادلہ کی بیشی کی بدولت بہت نقصان اور نفع ہوگا - جب شرح مبادلہ غیر معین ہوتی ہے تو بیرونی ممالک اپنا اصل دوسری جگہ نہیں لگاتے

درآمد برآمد

تیسری صورت درآمد برآمد کی ہے اگر اُس کے کاروبار پر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں بھی مبادلہ کی کمی بیشی

سے درہمی برہمی پھیل جاتی ہے۔ پہلے درآمد کو لیجئے اگر شرح مبادلہ دس ہو اور ایک گھڑی ایک پونڈ میں ملے تو گویا اس گھڑی کی قیمت دس روپیہ ہوئی۔ اگر شرح مبادلہ پندرہ ہوجائے تو اسی گھڑی کی قیمت ہندوستان میں پندرہ ہوجائیگی۔ اگرچہ انگلستان میں اس وقت بھی ایک ہی پونڈ ہوگی یہ گرانی صرف شرح مبادلہ کی وجہ سے پیدا ہوگئی۔ ہندوستان میں اس کی گرانی کی وجہ سے طلب گھٹے گی۔ جب طلب گھٹے گی تو یقیناً رسد بھی کم ہوگی اور رسد کم ہونے سے گرانی میں مزید اضافہ ہوگا،

اس کے برخلاف برآمد پر نظر ڈالئے۔ فرض کیجئے کہ ہندوستان میں گیہوں کی قیمت دس روپیہ من ہے اور پونڈ کی شرح مبادلہ بھی دس تو گویا ایک پونڈ میں ایک من گیہوں ملا۔ اگر شرح مبادلہ پندرہ ہوجائے تو ایک پونڈ ہی ڈیڑھ من گیہوں ملنے لگے گا۔ یہ معلوم ہے کہ قیمت کی کمی سے طلب میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب ایک پونڈ میں ڈیڑھ من گیہوں ملے گا۔ تو گیہوں کی طلب بہت بڑھ جائیگی۔ اس اضافۂ طلب سے قیمت میں اضافہ ہوگا اور ایسی زمینوں پر جن پر ابھی تک کاشت نہیں ہوتی تھی کاشت ہونے لگیگی اور ہر کھیت سے لوگ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کریں گے ایک طرف تو اس اضافۂ قیمت سے ملک میں عام گرانی پھیل جائیگی اور دوسری طرف چونکہ زمین قانون تقلیل حاصل کے تحت ہے اس لئے ہر اضافۂ پیداوار زمین کی قوت کو کم کرے گی اور پیداوار بالآخر کم ہونے لگے گی۔ اس طرح ایک طرف تو ملک میں عام گرانی بڑھے گی اور دوسری طرف زمینیں بھی خراب ہونگی۔ غرض ہر حال میں ملک کا نقصان ہوگا اور یہ سب صرف مبادلہ کی کمی بیشی کا نتیجہ ہوگا

ابو المنصور حمید

اگر ایک سرخ چھپی ہوئی تحریر

آپ کو رسالہ کے اندر کسی جگہ رکھی ہوئی ملے جسمیں آپ کے چندہ کے ختم ہونیکی اطلاع ہو تو مہربانی فرماکر آئندہ کیلئے فیصلہ کرکے منی آرڈر بھیجدیجئے اسمیں آپکا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ۳ر وی پی کے بچ جائینگے اور جذبات بھاشا قیمتی ۱۲ر آپ کو مفت ملجائیگی۔

جن لوگوں کا چندہ ذریعہ منی آرڈر ۵ جولائی تک نہ ملیگا انکو جولائی کا رسالہ ذریعہ وی پی روانہ کیا جائگا لیکن جذبات بھاشا انھیں نہ ملیگی

"مینیجر نگار"

شکست تمنا

شورش و ہنگامے سے فکرِ سکوں برباد تھی خاطرِ مجبور اک مجموعۂ اضداد تھی
دل کی دنیا منتشر تھی روح بھی ناشاد تھی سینۂ پر شوق میں دیوانگی آباد تھی
سیرِ گلشن کی مجھے بیساختہ رغبت ہوئی
مائل فرزانگی بڑھ کر مری وحشت ہوئی

آچکا تھا موسمِ گل بعد از فصلِ خزاں حسن پر تھا رنگِ گل نقش و نگار بوستاں
بھینی بھینی تھی چمن میں نکہتِ عنبر فشاں پتی پتی سے عیاں تھی خوبیٔ باغِ جناں
چھٹ پٹا تھا وقت مطلق دھوپ میں گرمی نہ تھی
تھی ہوا کچھ تُند یعنی چال میں نرمی نہ تھی

تھی زمیں سرسبز اک پھول تھا آغوش وا صحنِ گلشن تھا کہ تھا اک شاہدِ رنگین ادا
مرمریں فواروں سے آتی تھی قلقل کی صدا اٹھ رہی تھیں مست لہریں نہریں بھی جابجا
قطرے پانی کے اچھل کر دُر فشاں ہوتے رہے
اپنے دل میں خوش طیور خوش بیاں ہوتے رہے

آڑی ترچھی پڑ رہی تھی سبز کونپل پر کرن یا جوانانِ چمن کا تھا طلائی پیرہن
حسن پر مغرور اپنے یاسمین و یاسمن غنچے یوں پتوں میں تھے چلمن میں ہو جیسے دلہن
حُسنِ فطرت جلوہ ساماں اس گلشن میں تھا
اجتماعِ دلفریبی شام کے دامن میں تھا

دفعتاً بدلا سماں اور ایک سناٹا ہوا چھپ گیا خورشید تاریکی میں گھبرایا ہوا
گوشۂ مغرب میں "رنگ قرمزی" پیدا ہوا آسماں پر چاند نکلا نور میں ڈوبا ہوا
چاندنی کے کھیت میں شبنم گہر بونے لگی
غنچہ و گل کی مہک کچھ تیز تر ہونے لگی

ہلکی ہلکی چاندنی میں چھپ گئی ساری فضا اور اٹھلاتی ہوئی چلنے لگی ٹھنڈی ہوا
بھیکی بھیکی روشنی میں ہر گل رنگیں قبا بھینی بھینی نکہتوں کا ایک مجموعہ بنا

رفتہ رفتہ خامشی چاروں طرف چھانے لگی
نیند کی سی آنکھ میں اک کیفیت آنے لگی

میں اسیر رنگ و بوئے حسن فطرت ہوگیا　　دل نثار لذت انعام نکہت ہوگیا
دیدۂ پرشوق وقف شان قدرت ہوگیا　　اور شہباز تخیل محو وسعت ہوگیا

کھل گئیں آنکھیں تماشائے دو عالم کیلئے
گر پڑے آنسو مرے تقلید شبنم کیلئے

بحر نیلی میں رواں تھیں کشتیاں یوں نور کی　　آب جو میں بجلیاں ہوں جیسے کوہ طور کی
کیوں نہ ملتی پھر خبر ساحل کے قرب و دور کی　　کرتی جاتی تھیں وہ شرح منصب مامور کی

کہکشاں کے جام میں اک جوش جوئے شیر تھا
اور مریخ فلک ظرف تمنا گیر تھا

داغ مہ یوں تھا عیاں اک زورق پرنور میں　　جیسے پیوستہ ہو پتلی دیدۂ مخمور میں
یوں شعاعیں بھر گئی تھیں کاسۂ معمور میں　　"بادۂ سرجوش" جیسے ساغر بلور میں

جاذب ادراک تھیں نیرنگیاں اس رات کی
باعث حیرانیاں تھیں ستیاں اس رات کی

آسمانی بزم میں ضوگستری کا جوش تھا　　ایک اک ذرہ جہاں کا ساکت و خاموش تھا
میں سرور بادۂ حیرت سے گو مدہوش تھا　　شوق کی آنکھیں کھلی تھیں مستعد ہر گوش تھا

الغرض اللہ رے امید و بیم کیف انتظار!
جل رہی تھی دل جگر دونوں پہ سیف انتظار!!

رفتہ رفتہ زلف شب زیر کمر ہونے لگی　　شمع محفل خوگر جور سحر ہونے لگی
خوش خرامی صبا بیداد گر ہونے لگی　　بانگ مرغ بوستاں بانگ نفیر ہونے لگی

تھا یہی عالم نئی اک پھانس دل میں گڑ گئی
ایک رشک گل سے چشم شوق جا کر لڑ گئی

تھی وہ گلرو یاسمن بو لالہ رخ مست شباب　　تھا سراپا اس کا جوش حسن فطرت کا جواب
چشم کی گردش میں لطف گردش جام شراب　　پتلیوں میں بجلیاں تھیں بجلیوں میں تھا حجاب

اکھڑی اکھڑی ہوا داتی اس طرح مچلی ہوئی
جس طرح رندوں کی نیت ابر میں بدلی ہوئی

عارضِ گلرنگ سے "حسنِ تنوع" تھا عیاں   یا شبابِ شوق میں گلریز تھا کیفِ نہاں
پتلے پتلے ہونٹوں میں برقِ تبسم تھی رواں   جو صبر و سکوں کا کر رہی تھی امتحاں
لرزشِ لب میں تکلم کی فضا پوشیدہ تھی
سامعہ کے واسطے برقِ غضب لرزیدہ تھی

جلوہ گاہِ حسن میں جو ذرہ تھا مسجود تھا   سبزۂ فرشِ خاک پر پائے حنا آلود تھا
رازِ مخفی "پیکرِ مخمور" میں موجود تھا   ذرہ ذرہ فطرتِ معصوم کا مشہود تھا
زلف کی شبگونیت تھی سر بسر ہمت ربا
حسن کی موزونیت تھی طاقت قسمت ربا

مست آنکھیں دیکھ کر سوجھی سے دیوانہ ہوا   انتہائے شوق میں اپنے سے بیگانہ ہوا
از سرِ نو دل کا پھر آباد ویرانہ ہوا   کعبۂ احساس میرا مثلِ بت خانہ ہوا
کھنچ گیا میں اس طرح اس حسنِ زیبا کی طرف
جام ساغر جس طرح جھکتے ہیں مینا کی طرف

کاوشیں قلب و جگر کی پھر سرور افزا ہوئیں   آرزوئیں کوہِ طورِ درد کی موسیٰ ہوئیں
دیکھ کر مجھکو وہ آنکھیں مائلِ ایما ہوئیں   شرم آلودہ نظر سے بجلیاں پیدا ہوئیں
دل مرا بیتاب اظہارِ محبت ہو گیا
یعنی ایمانِ تمنا نذرِ الفت ہو گیا

کچھ سمجھ کر پہلے تو خاموش تھی مستِ شباب   چینِ پیشانی تھی لیکن ترجمانِ اضطراب
"زلفِ برہم" بنگئی تھی مرکزِ صد پیچ و تاب   یا زبانِ حال سے دیتی تھی مجھکو یہ جواب
"عشق کے کعبے میں عاشق کو یہی پیغام ہے
جامۂ صبر و رضا بس جامۂ احرام ہے"

گو شرابِ تند جوش بادۂ گلفام ہے   جو نہ چھلکے مست ہو کر بس وہی اک جام ہے
راہِ الفت میں تمنا اک خیالِ خام ہے   عشق خود آغاز ہے خود عشق ہی انجام ہے
جوش و مستی بھی ہو تو دائرے میں ضبط کے
شکوہ ریزی بھی جو ہو تو قاعدے میں ربط کے

اس عتابِ بے سبب نے "محوِ حیرت" کر دیا   واقفِ رنج و غم و دردِ محبت کر دیا

کائنات دل کو محروم مسرت کر دیا   گلشن امید کو مایوس نکہت کر دیا

دل بگڑ کر رہ گیا میں، دم مچل کر رہ گیا

نالۂ دل، دل ہی میں کروٹ بدل کر رہ گیا

پھیر کر منہ باغ سے جب دم نہ رخصت ہو گئی   مجھ پہ طاری ہجر کی جانسوز غفلت ہو گئی

میری مونس میری ہمدم دل کی حسرت ہو گئی   سوزش قلب و جگر سے خاص الفت ہو گئی

ساز ہستی اب مرا حافظ اذیت کوش ہے

ہر نفس سرمایہ دار نغمہائے دوش ہے

حافظ غازیپوری

اعجاز علم

اے علم تو نے دنیا کو روشنی عطا کی   انجم کی بزم میں ہے شہرت تری ضیا کی

لوح فلک پہ کندہ نقش و نگار تیرے   ارض و سمائے مالک ہیں رازدار تیرے

سیارے تیر خط پر کار چرھتے ہیں   دھنتے ہیں اپنا سر اور رہ رہ کے جھومتے ہیں

تو حسن لم یزل ہے، اللہ ری تیری تقدیر!   مہ تیرے آئینہ میں تکتا ہے اپنی تصویر

آتشکدہ میں تیرے ہیں برق کے شرارے   اور تیری بزم کے ہیں فانوس ماہ پارے

تار نفس سے تیرے قائم ہے ساز ہستی   وابستہ جستجو سے تیرے ہیں راز ہستی

ایوان آسماں سے اوپر رسائی تیری   قصر جناں میں ہر سو جلوہ نمائی تیری

قلزم کی وادیوں میں موتی دکھائے تو نے   آب رواں کی تہ میں گلشن اگائے تو نے

اوج فضا میں اپنی محفل سجائی تو نے   موج ہوا پر اپنی کشتی اڑائی تو نے

صحرا کی خاک تک میں گلشن کے رنگ بھرنا!   واللہ تیری خو ہے فطرت سے جنگ کرنا

محمود اسرائیلی

اگر آپ خط و کتابت میں نمبر خریداری نہیں لکھتے تو جواب کی توقع بیکار ہے۔ "مینیجر نگار"

پرستشِ خیال

(ایک تصویر کو دیکھ کر)

جلوہ ہائے عظمتِ تقدیس کی دنیا ہے تو
فطرتِ معصوم کا اک موجزن دریا ہے تو
پاکیوں کے نور خوابیدہ تیری تصویر میں
عصمتوں کے خواب پوشیدہ تری تعمیر میں
تیرا ہر انداز درسِ عصمتِ جذبات ہے
تیرا ہر پیغام تفسیرِ الٰہیات ہے

اے جمیلہ! شاہدِ قدرت ہے شیدائی تری
اے حسینہ! لیلیِ فطرت ہے سودائی تری
بہ رہے ہیں چشمہ ہائے نور قدموں میں ترے
لوٹتا ہے جلوہ زارِ طور قدموں میں ترے
یہ ادائے والہانہ یہ نگاہِ پاک باز
ہیں انھیں جلووں میں پنہاں عصمتِ فطرت کا راز
عصمت آبادِ حیا آرا تری تخئیل ہے
تو علوئے عظمتِ انساں کی تکمیل ہے

"بُت" کے جذبات سے لبریز ہے دنیا تری
آہ اے اندازۂ الفت خیز ہے دنیا تری
جلوہ ہائے حسنِ پاکیزہ کا گہوارہ ہے تو
فطرتِ معصوم کا اک پاک نظارہ ہے تو
دستگیرِ حاملانِ عرش ہے عظمت تری
احترامِ ساکنانِ فرش ہے عصمت تری
تو سرورِ عصمتِ جذبات سے سرشار ہے
"بے نیازِ دہر" تری فطرتِ خوددار ہے
جستجو کی وسعتوں سے دور ہے دنیا تری
پردۂ تقدیس میں مستور ہے دنیا تری
تو بھی اک غنچہ ہے لیکن بے نیازِ رنگ و بو
تو بھی اک گوہر ہے لیکن تاجدارِ آبرو
تیری عصمت عظمتِ انساں کی تاسیس ہے
اے مقدس نازنیں! تو چشمۂ تقدیس ہے
تیری ہستی عصمتِ قدرت کا استحکام ہے
تو خدائے قدس کا اک دلربا پیغام ہے

میں اگرچہ عظمتِ تقدیس سے محروم ہوں
شکر کرتا ہوں کہ تیرے عشق میں معصوم ہوں

روش صدیقی

حیات

سایۂ تیغ میں بھی جب میں نے قضا نہ کی نماز — دہر میں عام ہو گیا میرا فسانۂ نیاز
کھوئے گئے ظہور میں ڈوب گئے سرور میں — تیرا پیام غم رہا تیرا کلام دل نواز
تاروں کا خوں نچوڑ کر خاک نثار دے گیا — عرصۂ دہر میں مگر کھول سکا نہ تیرا راز
جلوۂ مہ کہاں گیا جوشِ بہار کیا ہوا — تشنۂ بے ثبات ہے حسن پہ کیا غرور و ناز
زاہدِ پُر فریب کا کیجئے اعتبار کیا — شیخ حرم سے دوستی پیر مغاں سے ساز باز
حُسن غلام ہو کے بھی کتنا شکوہ دار ہے — دیدۂ غزنوی سے تو دیکھ ذرا رُخِ ایاز
تجھکو مرے علاج کا فکر عبث ہے چارہ گر — تیری دوائیں بے اثر عشق کا درد جانگداز
تارے بھی آسمان پر چشم پُر آب ہو گئے — رات کسی کے ہجر میں دیکھ کے میرا سوز و ساز
سچ ہے وہ بدنصیب ہی لطفِ حیات پا گیا — جس کی شب فراق ہے عمرِ خضر سے بھی دراز
میری زبان میرا دل تیرے غلام ہو چکے — دین مرا تری رضا ذکر ترا مری نماز
مست نشاط ناخدا بحرِ حیات موجزن — تیرے سپرد اے خدا میری مراد کا جہاز

بادہ گسار ہو گیا سارا جہان اے نظیر
دیکھ کے میرے ہاتھ میں ساغر بادۂ حجاز

نظیر لودھیانوی

اسلامی لغت

مرتبہ سید حامد حسین رضوی علیگ

جلد اول تیار ہو گئی ہے جسمیں حرف "ثنا" تک تمام وہ الفاظ مع مکمل تشریح و تفسیر کے درج کئے گئے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہبی، اقتصادی، جغرافی، تاریخی، علمی، معاشرتی لٹریچر سے ہے نہایت ضروری کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ۲؍۸ (دو روپے آٹھ آنے)

منیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ

اسباب مخاصمت

(۱)

کچھ تجھکو خبر ہے ترا دشمن ہے فلک کیوں؟ معلوم بھی ہے تیری مخالف ہیں ملک کیوں؟

مجبور ہیں وہ

صاحب کردار ہے توہی

مختار ہے توہی

(۲)

کیوں شام و سحر ہیں ترے نقصان کے درپے؟ اے زندۂ جاوید! تری جان کے درپے؟

غصّہ ہے انہیں

کیوں تری قسمت میں بقا ہے؟

توچیز ہی کیا ہے؟

(۳)

کیوں درپئے آزار زمان بھی ہے مکاں بھی؟ میں تجھکو بتا سکتا ہوں یہ راز نہاں بھی

تھا غرّہ انھیں

وسعت و پنہائی پہ کیا کیا!!

جو تونے مٹایا

(۴)

بت تبکدۂ ہست کے ایمان کے دشمن ایمان کے دشمن ترے عرفان کے دشمن

ہے ان کو حسد

کیوں تجھے وجدان ملا ہے؟

ایقان ملا ہے؟

امین حزیں

غزل اثر رامپوری

سوئے در آنکھیں لگی ہیں، دو سراپا گوش ہے
مرنے والے میں ابھی اتنا تو باقی ہوش ہے

وہ اُدہر آئینگے جائینگے ادہر صبر و قرار تو
انتظار دوست تمہید وداع ہوش ہے

یہ سوادِ شامِ غم کا رنگ بھی ہے دیدنی
آسماں پر آج تاروں کی فضا خاموش ہے

وہ معما ہے یہ انساں بھی جو حل ہوتا نہیں
اس قدر کم فہم بھی ہے جسقدر ذی ہوش ہے

تیرے سودائے محبت میں کمی پاتا ہوں کچھ
یہ سر شوریدہ اب مجھ کو وبالِ دوش ہے

کس قدر دلچسپ ہے افسانۂ حسن و جمال
کائناتِ دل کا ہر ذرہ سراپا گوش ہے

ہے زمانے سے جدا رسمِ جہانِ عاشقی
ہوگیا بیہوش جو اسمیں وہی باہوش ہے

شک نہیں اسمیں کہ مستقبل ہے اُسکا شاندار
آج جسکو فکر فردا ہے خیال دوش ہے

پیشِ جاناں صورتِ تصویرِ حیرت ہوں اثرؔ
حالِ دل کہتی ہیں آنکھیں اور زباں خاموش ہے

جگر بریلوی

جان اُن پر نثار کرتا ہوں — مژدہ اے زندگی کہ مرتا ہوں
شوق نے کردیا ہے دیوانہ — ذرے ذرے کو سجدہ کرتا ہوں
دل میں دیتا ہوں عوتیں غم کو — اپنا پیمانہ آپ بھرتا ہوں
آج قابو نہیں رہا دل پر — ہوک اٹھتی ہے نالہ کرتا ہوں
لا رہا ہوں اُنھیں تصور میں — اپنے خاکہ میں رنگ بھرتا ہوں
ہو نہ جائے یہ باعثِ پندار — تیرے لطف و کرم سے ڈرتا ہوں

کیا کہوں زندگی کا حال جگر
جبر سہتا ہوں ضبط کرتا ہوں

خواجہ مسعود علی ذوقی

اقلیم دل کو عشق نے ویراں بنادیا — اک آرزوئے خام کا زنداں بنادیا
اُف وہ نگاہِ لطف کی بیجا نوازشیں! — خود چشمِ التجا کو پشیماں بنا دیا
رندِ آشنائے لذتِ درماں عشق نے — صہبائے غم کو بادۂ عرفاں بنا دیا
پھر کیوں اسیرِ بندشِ ایماں کیا مجھے — جب آشنائے لذتِ عصیاں بنادیا
دیپر وہ میرے دل کا تقاضائے شوق تھی — وہ چیز جس نے غم کو فراواں بنا دیا
میں اس خرامِ ناز کی شوخی کو کیا کہوں — ویرانیوں کو جس نے گلستاں بنا دیا
اس طرح تیری یاد نے نشتر چبھوئے ہیں — تارِ نفس کو تارِ رگِ جاں بنا دیا

محویتِ جنوں میں وہ ذوقی کی بے خودی
دامانِ غیر کو بھی گریباں بنا دیا

راز رامپوری

علاج کیا ہے زمانہ کی دشمنی کے لئے — کہ موت بھی تو نہیں میری زندگی کیلئے
اگر یہی ہیں نشاطِ مذاق کے معنے — مجھے تباہ بھی کردیجے دلگی کیلئے
فلک بھی دوست ہوا اُسکا تو فائدہ کیا ہے — جسے اک آپ سا ملجائے دشمنی کیلئے
نتیجہ اس دلِ بیمار کا خدا جانے — نہ موت ہی کیلئے ہے نہ زندگی کیلئے
نہیں ہے اہلِ زمانہ سے کچھ اُمید مجھے — یہ لوگ سب ہیں تماشائے بیکسی کیلئے

وفا کی موت بڑے خوش نصیب مرتے ہیں
یہ دن تو ورنہ زمانہ میں ہے سبھی کیلئے

فلک خلاف زمانہ عدو ہے تم دشمن
قضا نہ آئے تو کون آئے دوستی کیلئے

حدود ظاہر و باطن میں فرق ہے اتنا
کہ موت مال ہے دل کی تونگری کیلئے

حجاب عقل کی نیرنگیاں یہ فرضی ہیں
چمن میں رونے کو شبنم ہے گل ہنسی کیلئے

مرا قصور ہے معیار آدمیت کا
کہ راز ختم ہے معصومیت بنی کیلئے

کیفی چریاکوٹی

اُن کی الفت میں مٹ چکا ہوں میں
وہ اگر جان ہیں تو کیا ہوں میں

دم لبوں پر یہ آکے کہتا ہے
زندگانی کا انتہا ہوں میں

مجھ کو جو بزم سے نکال دیا
کیا رقیبوں کا مدعا ہوں میں

تم جو دینے پہ مجھکو آؤ گے
تم کو مانگوں گا وہ گدا ہوں میں

کچھ رسائی کی راہ نکلے گی
تم جو آؤ تو نقش پا ہوں میں

ہوش تھا جب تھی جستجو اُن کی
مل گئے وہ تو کھو گیا ہوں میں

دم لبوں پر کبھی نہیں آتا
نالہ ہر چند کھینچتا ہوں میں

دیکھ! اے مجھ کو دیکھنے والے
کس طرح تجھکو دیکھتا ہوں میں

کردے آہِ سحر مجھے ٹھنڈا
رات بھر بزم میں جلا ہوں میں

اس کی محفل کی کچھ نہ پوچھ اے دل
درد کی شکل میں اُٹھا ہوں میں

اب سرِ بزم پی نہیں سکتا
سب یہ کہتے ہیں پارسا ہوں میں

وہ سمجھ میں جو کچھ نہیں آتا
بُت بھی کہنے لگے خدا ہوں میں

کعبہ یا دیر سے مجھے کیا کام
اس کے در پر پڑا ہوا ہوں میں

اپنا مذہب یہی ہے اے کیفیؔ
بندۂ شاہ کربلا ہوں میں

ضرورت ہے اگر آپ کو خیمے، دریاں اور چرمی سامان کی ضرورت ہو تو فوراً ہمیں ایک کارڈ لکھئے ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزان ملتا ہے۔ والی ریاست بڑے بڑے روسا ہمارے ہی یہاں سے مال منگاتے ہیں۔ فہرست اردو یا انگریزی کی منگا کر ملاحظہ فرمائیے ہمارا کارخانہ صداقت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا ہے۔

ملنے کا پتہ

محمد حسین اینڈ کو ٹنٹ مرچنٹ فتح گڑھ یوپی

ڈائری کا ایک ورق

چاند کا سفر

موسم بہار شباب پر ہے لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ

پہلے شگفتہ ہوتا ہے دل، بعد کو گلاب

تو مجھے کہنا چاہئے کہ:-

اب کے خزاں بہار سے پہلے ہی آگئی

رات زیادہ گزر گئی ہے۔ ساری دنیا محو خواب ہے اور میں اوپر کی منزل میں تنہا بیدار۔ خلوت کی بیداری بھی کس قدر عجیب ہے: یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پردہ آہستہ آہستہ کھلتا جا رہا ہے اور اُس کے نقوش یکے بعد دیگرے نگاہ کے سامنے سے گزرتے جا رہے ہیں؛ ماضی کی داستان بھی کس قدر پُر لطف داستان ہے، اور کتنی حسرتیں ہماری اس کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں، حال تو گویا ریاضی کا نقطہ ہے کہ خود اس کا کوئی وجود نہیں ہے، لیکن تمام خطوط و دوائر اسی کی جنبش کا نتیجہ ہیں؛ مستقبل نام ہے صرف توقعات کا مفروضات کا، تمناؤں کا، لیکن توہمات پر انسان جی تو سکتا ہے، مسرور نہیں ہو سکتا، اس لئے ایک ذرا پختہ عمر کے انسان کے لئے بہترین مشغلہ تنہائی کا یہی ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے واقعات پر غور کرے، گزری ہوئی باتوں کو یاد کرے اور اگر ایام شباب گزر چکے ہیں تو رات کا بڑا حصہ اس کے ماتم میں صرف کر دے۔ کم ہیں وہ لوگ جن کا شباب ان کی تمناؤں کے اندازہ سے خوشکام بسر ہوتا ہے، اسلئے عہد ماضی کے افسانہ کا یہ ٹکڑا جسقدر بھی حسرت انگیز ہو کم ہے۔ لوگ وقت گزر جانے پر بھی امیدوں کی فرضی دنیا قائم کرتے رہتے ہیں اور پھر خود ہی مایوس ہو کر اُس مسمار کر دیتے ہیں۔ یہ ہیں انسانی بے بال و پری کے آخری حدود! دیر تک دماغ میں مختلف خیالات آتے رہے اور پھر کچھ دیر تک فلکیات کے بعض مسایل پر غور کرتا رہا اور چاند کی خنک آب و تاب میں آنکھ بند کر کے لیٹ رہا۔

....

....

جیسے کسی نے یہ کہکر جگا دیا ہو کہ، ہوائی جہاز طیار ہے۔۔ ہاں، یاد آیا مجھے بھی تو سفر کرنا تھا، اُٹھا داڑھی مونڈھی، کنگھا کیا، کپڑے بدلے، گرم کپڑوں کا صندوق، موٹے موٹے کمبلوں کا بستر اور ایک بکس مختلف ضروری چیزوں کا خادم کے ذریعہ سے موٹر تک پہونچایا اور چلدیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد خیال آیا کہ ٹکٹ تو نہیں بھول آیا، جیب میں ہاتھ ڈالا تو موجود تھا۔ یہ ٹکٹ ایک سال کا موسمی ٹکٹ تھا اور عمومی تھا، عمومی سے مراد یہ کہ میں کرۂ ارض کے ہر مقام سے سفر کر سکتا تھا، اور کرۂ قمر کے ہر مقام تک جا سکتا تھا۔ مسٹر ولیٹسن

کمپنی چونکہ سب سے زیادہ معتمد علیہ کمپنی تھی اور اس کے جہاز بھی نہایت تیز رو اور آرام دہ ہیں اس لئے کرایہ تو ضرور زیادہ ادا کرنا پڑا۔ لیکن میں نے اسی کو ترجیح دی اور آخر کار سب کو خیر باد کہہ کے اس کرہ کی سیاحت کے لئے چل دیا جس کے تابناک وجود کی ہمارے کرۂ ارض کے بہت سی عشق خیز راتیں گردیدۂ احسان ہیں۔

دس منٹ میں یوبو گراونڈ کے میدان میں پہونچ گیا اور کپتان کو ٹکٹ دکھاکر غیر ضروری سامان، چھت کے ایک کمرہ پر رکھوکر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ صبح کا وقت تھا، ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی بادلوں کے ٹکڑے کہیں کہیں نظر آتے تھے۔ لیکن بالکل دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہلکے اور تنک۔ بگل کی بلند آواز بلند ہوئی، جھنڈا کھول دیا گیا اور سامنے کا پہیہ گردش کرنے لگا۔ ہلکی سی جنبش ہوئی اور تین پہیوں کے اوپر جہاز تھوڑی دور چلکر فضا میں آہستہ آہستہ بلند ہوتا گیا۔

میرے علاوہ نو آدمی اور بھی تھے جن میں سے تین عورتیں، دو نوجوان لڑکیاں اور چار مرد تھے، یہ سب امریکہ کے باشندے تھے اور براہ راست وہیں سے سوار ہوئے تھے۔ یہ جہاز دو درجوں میں منقسم تھا، اوپر کا درجہ اسباب کے لئے تھا اور دوسرا بیٹھنے، سونے اور کھانے کے لئے، لیکن ہر کام کے لئے مختلف حصے تھے، کپتان کے کمرہ میں ایک طرف لاسلکی ٹیلیفون اور ریڈیو لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف ایک بڑی گھڑی نہایت ہی پیچیدہ مشینری کی نصب تھی جسکے ذریعہ سے درجۂ حرارت، موسمی کیفیت طول البلد، عرض البلد، درجات نلکی اور خدا جانے کیا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔

میری جگہ بالکل دریچہ کے پاس تھی اس لئے بلند ہوتے وقت نہایت اچھی طرح محسوس کرتا جاتا تھا کہ تمام مکانات اور درخت وغیرہ کس طرح چھوٹے ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد شہر کا بلند مینار صرف ایک چھوٹا سا دھبہ نظر آنے لگا، سردی بھی بڑھتی جاتی تھی اور کبھی کبھی بادل کے ٹکڑوں کے اندر سے ہم کو گزرنا پڑتا تھا، لیکن یہ بادل بالکل خشک تھے اور دریچوں کے شیشوں پر ایک ہلکے سے نم کے علاوہ اور کوئی اثر نہ پیدا کرتے تھے۔

جس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس جہاز کے تمام مسافر بھر گئے ہیں اور اب براہ راست بغیر راہ میں کہیں قیام کئے ہوے سیدھے کرۂ قمر تک کا سفر کرنا ہے تو میرے اعصاب میں اک خاص قسم کی بے چینی محسوس ہونے لگی اور میں سوچنے لگا کہ دیکھئے وہاں کیونکر گزرتی ہے اور کس طرح واپسی ہوتی ہے۔

جہاز کی رفتار نہایت تیز ہوتی جاتی تھی اور سامنے جو رفتار پیما لگا ہوا تھا وہ بتا رہا تھا کہ اس وقت ہم ۳۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہے تھے، لیکن معلوم ہوا کہ ابھی اس کی دوچند رفتار اور بڑھیگی۔ میں بیٹھا ہوا اپنی اس نئی سیاحت کے متعلق غور کر رہا تھا کہ خادم آیا اور میرے سامنے کے مسافر پاس ایک تار لایا جو اسوقت لاسلکی کے ذریعہ سے موصول ہوا تھا۔ یہ اسے دیکھکر فوراً اٹھا اور ٹیلیفون کو امریکہ کے کسی کارخانہ سے ملاکر کاروبار تجارت کے متعلق کچھ ہدایات کرنے لگا۔

میں سخت حیران تھا کہ اس وقت جب کہ جہاز کم از کم ۲۰۰ میل کی بلندی پر فضا میں اڑ رہا ہے کیونکر امریکہ کے کسی آدمی سے براہ راست گفتگو کرنا ممکن ہے۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے جو میرے سامنے ہو رہا تھا اور کوئی وجہ اس سے انکار کی نہ تھی۔

دن بھر کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی۔ کیونکہ اب کرۂ ارض کا کوئی حصہ ہمکو نظر نہ آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا جہاز صرف آسمان کے نیل میں تیرتا ہوا جارہا ہے، ہوا چونکہ ۱۰۰ میل کے بعد ہی ختم ہوگئی تھی اس لئے ہر شخص کے منہ سے آکسیجن کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں اور نبض کی رفتار ۱۵۰ فی منٹ تک پہونچ گئی تھی۔

شام کو چاند کے طلوع کا نظارہ بہت دلچسپ تھا اور وہ آج ہم سے زیادہ قریب نظر آتا تھا۔ ٹھیک اس وقت جبکہ ہم لوگ کھانا کھاکر سینما دیکھ رہے تھے، کرۂ قمر سے ایک لاسلکی پیغام کپتان کو موصول ہوا، کپتان ہم لوگوں کے کمرے میں آیا اور کہنے لگا کہ چاند کے بڑے سمندر میں شدید سیلاب ہونے کی وجہ سے جلد وہاں پہونچنا خطرہ سے خالی نہیں ہے اس لئے یہ سفر کم از کم دس دن اور بڑھ جائے گا، کیونکہ جہاز کی رفتار کم کرنا ہوگی۔ بعض کو اس خبر سے خوشی ہوئی، بعض کو رنج، لیکن میں نے اس کو مذاق سمجھکر کوئی اثر نہیں لیا اور سامنے پردہ پر نہایت لطف کے ساتھ میری پکفورڈ کی ایکٹنگ کو دیکھتا رہا۔ میں زیادہ جزئیات سے بحث نہیں کرونگا اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کیونکہ حقیقتاً اب جہاز میں کوئی نیا تجربہ نہ ہوتا تھا، وہی کھانا پینا، سینما دیکھنا اور سوجانا روز کا مشغلہ تھا، اب میرے مراسم لوگوں سے کافی طور پر بڑھ گئے تھے، اور اس لئے بعض اوقات برج کھیلنے میں بھی مشغول ہو جاتا تھا ایک دن البتہ جہاز کا انجن کچھ برہم سا ہوگیا تھا اور جہاز نیچے کی طرف مائل ہونے لگا تھا، لیکن کپتان نے فوراً دوسرا انجن کھولدیا اور پانچ میل سے زیادہ نیچے نہ اترتے تھے کہ جہاز پھر تازہ قوت کے ساتھ صعود کرنے لگا۔ بیس دن کے بعد ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ جہاز کی رفتار بہت بڑھ گئی لیکن رفتار پیما صفر پر ہے تھوڑی دیر میں کپتان مسکراتا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا سفر تو حقیقتاً آج ختم ہوگیا، اور اب ہمارا کوئی کام باقی نہیں رہا۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے لیکن جب معلوم ہوا کہ ہم کشش زمین کی حدود سے نکل کر کشش قمر کی حدود میں آگئے ہیں تو میں اسکا مدعا سمجھا۔ الغرض ہم چاند کی طرف خود اپنی قوت سے نہیں جارہے تھے۔ بلکہ چاند خود ہمیں اس طرح کھینچ رہا تھا جس طرح زمین پر کوئی ڈھیلا اوپر کی طرف پھینکئے اور وہ تیزی کے ساتھ زمین کی طرف مائل ہو۔ جہاز اس وقت زمین کی طرف اترنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ چاند کی کشش دفعتہً اسے نہ کھینچ لے اور اس طرح یہ خطرہ باقی نہ رہا تھا کہ ہم چاند میں پہونچکر دفعتہً کسی چیز سے ٹکرا جائیں گے۔ اُسوقت سب سے زیادہ حیرت انگیز تجربہ میرے لئے یہ تھا کہ میرا بدن بالکل ہلکا ہوکر پھول سا ہوگیا تھا۔ اور جسوقت میں قدم اٹھاتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُڑ رہا ہوں۔

باقی ـــــــ باقی

نیاز

زنان بازاری

کی پر اسرار زندگی کے متعلق چھ عجیب و غریب ناول

سعید۔ یک تعلیم یافتہ نوجوان وایک پاتر کے جذبات کا بہترین خاکہ انجام اخلاقی فلاح پر کیا گیا ہے عمر

شاہد رعنا۔ دہلی کی ایک ڈیرہ دار طوائف کی خود نوشت سوانح عمری بچپنے سے لیکر بڑھاپے تک کے حالات مکر و فریب کی داستان آپ بیتی کی صورت میں عجیب پر لطف قیمت ...... عمر

انجام عیش۔ بدکاری اور آوارگی کے مختلف پہلو قصہ کی صورت میں اس قدر تکمیل کیسا تھ دکھائے گئے ہیں کہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آسکتے سوسائٹی کی اصلاح کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے قیمت ۱۱

سعادت۔ دہلی کی ایک تعلیم یافتہ سلیقہ مند خوبصورت طوائف کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عاشقانہ خط و کتابت اور وصل و فراق کے کیفیات کو عجیب انداز سے بیان کیا گیا ہے قیمت ۸

سزائے عیش۔ فلسفہ حسن و عشق اور تفریحات عامہ پر عجیب و غریب کتاب ہے اسمیں ایک شریف گھر اور ایک طوائف کے دن رات کا ٹائم ٹیبل کا فرق دکھایا گیا ہے قیمت ۱۰

سراب عیش۔ طوائف سے نکاح کرکے انکو بہو بیٹیوں میں لاکر رکھنے کے نتائج قیمت ۱۰

منیجر نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

باب الاستفسار

مسئلہ معاد

مولانا!

نگار کے اکتوبر نمبر میں آپنے تصدق حسین صاحب کے سوال نمبر (۷) کے جواب میں فرماتے ہیں کہ "بہشت و دوزخ کے بیانات سب تمثیلی ہیں، اور لوگوں کے سمجھانے کے لئے اصل میں انکا تعلق صرف روحانی مسرت و اذیت سے ہے "

بیسویں صدی عیسوی کی یہ تاویلات قرآنی میں نے اکثر سنیں اور عموماً اس فرقہ سے جو اسوقت تہذیب و تمدن کا علم بردار ہے مجھے اس کے متعلق آپکے کچھ عرض کرنا ہے۔ غالباً آپ اسپر توجہ فرمائینگے،

مسرت و اذیت ہر دو کیفیات احساسی ہیں، اور ان کے لئے پہلے محرک اور سبب کا وجود ضروری ہے۔ اگر بہشت و دوزخ سے مراد مسرت و اذیتِ روحانی بھی ہو تو حسب قاعدہ مسرت و اذیت کے محرک اور سبب کا وجود سے مقدم ہوگا۔ اب قابلِ دریافت یہ امر ہے کہ حیات بعد الموت میں وہ محرک اور سبب کیا چیز ہوگی اور کس طرح انسانی روح پر مسرت و اذیت کے جذبات طاری ہوں گے۔ کسی مفید اور کار آمد چیز کی یافت سے انسان خوش ہوتا ہے اور اس کے فوت ہوجانے سے غمگیں۔ حیات بعد الممات میں کس چیز کی یافت سے ہم مسرور ہوں گے اور کس چیز کی نایافت سے مغموم۔

آپ روحانی مسرت و اذیت کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ روحانی مسرتیں اور اذیتیں ضرور مہم ہیں۔ مگر ایسی روحانی خوشی اور اذیت جسکے ساتھ جسمانی خوشی اور اذیت شامل نہ ہو اتنی قابلِ اعتنا نہیں۔ غم عشق ضرور جاں گسل ہے مگر ان کے ساتھ ہی اگر سر بازار ہر روز بلا ناغہ عاشقِ جانباز کے کوڑے بھی پیٹے جائیں۔ تو بھر یہ تکلیف بدرجہا زیادہ اذیت رساں ہوگی۔ لیکن مجھے تو اس میں بھی کلام ہے کہ روح کے لئے ایسی روحانی مسرت یا اذیت کا وجود جب روح جسم سے علیٰحدہ ہو۔ ممکن بھی ہے یا نہیں، کیونکہ ہمارے لئے کسی ایسی حالت کا تذکار جب ہماری روح کا پیوند جسم سے نہوا تھا محالات سے ہے۔ پھر آخرت جو دنیاوی زندگی کا اہم ترین مقصد ہے۔ کس طرح ایک ایسی خوشی یا اذیت سے عبارت ہو سکتی ہے جسکو کوئی فرد بشر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اور وہ انسان جو ہوا و حرص کا بندہ اور خواہشات نفسانی کا حلقہ بگوش ہے کیسے فقط مسرات روحانی پر اکتفا کرنے کے لئے تیار ہوگا؟

اگر بہشت و دوزخ کے بیانات تمثیلی ہوں اور اس سے مراد روحانی مسرت و اذیت ہو۔ تو ضرور ہے کہ ان روحانی مسرتوں اور اذیتوں سے صرف روح متمتع ہو اور بے چارہ جسم جس نے روح کا دنیا کی ہر دشوار گزار گھاٹی میں ساتھ دیا۔ جس کے سینے دشمنوں کے تیروں اور گولیوں سے چھلنی ہو گئے جس کے ہاتھ پاؤں قلعہ شکن توپوں اور ہوائی بمب باز جہازوں کے نذر ہو گئے، اور جس کے سر و دوش اینٹوں سے زخمی اور چور کئے گئے، بے یار و مددگار پیکر خاک ہو جائے، اور زمانے کے جھکڑ اور آندھیاں اسے اڑا کر نیستی کے سمندر میں غرق کر دیں، کیا اس وقت اسے حق نہ حاصل ہوگا، کہ زبان حال سے چلا چلا کر گلا پھاڑ پھاڑ کر دربار رب لایزال میں رو رو کر یوں عرض کرے۔ فاذا تکون کریھۃ ادعیٰ لھا۔ واذا یحاس الحیس یدعیٰ جندب۔ اس دنیا کے کاروبار میں روح اور جسم مسرت و اذیت میں برابر کے حصہ دار ہیں اور روحانی مسرت سے اگر طبیعت خوش ہوتی ہے تو جسم کا بھی اس میں برابر کا حصہ ہے اور جسمانی اذیت سے روح کے لئے بھی تکلیف اذیت ہے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا، کہ جب موت کے بعد انسان کے اعمال و افعال کا باقاعدہ جائزہ لیا جاتا ہے اور اسے اعمال کے مطابق مسرت یا اذیت کا حقدار ٹھہرایا جاتا ہے۔ تو اس وقت جسم کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ حالانکہ روح کو جس مسرت یا اذیت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس کا ارتکاب جسم کی معرفت عمل میں آیا تھا۔ ورنہ صرف روح ہرگز اس قسم کے جرائم یا اعمال حسنہ کا ارتکاب نہ کر سکتی۔ اگر یہ صحیح ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ جسم کو بھی اس مسرت و اذیت میں برابر کا حصہ دار نہ قرار دیا جائے؟

آپ کو یاد ہوگا، کہ گزشتہ جنگ بلقان میں بلغاریا اور سرویا نے کس طرح اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈال کر ایڈریانوپل فتح کیا تھا۔ کیا آپ ان کی اس خوشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو انہیں اس فتح سے حاصل ہوئی ہوگی۔ لیکن اگر کوئی فیلسوف ان سے اسوقت یہ کہتا۔ کہ جسمانی منافع اور خوشیوں سے روحانی خوشیاں اور منافع بدرجہا دلاویز تر ہیں اور تم حیات بعد الممات کی خوشیوں اور اذیتوں کو بھی اس قبیل سے قرار دیتے ہو۔ کیا اچھا ہو۔ اگر تم ان خوشیوں سے مماثلت پیدا کرنے کے لئے ایڈریانوپل کو بعد فتح کرنے کے پھر ترکوں کے حوالہ کر دو، کیونکہ تمہیں فتح سے جو روحانی مسرت حاصل ہوئی ہے وہ کیا کم ہے، اور انہیں جو شکست سے روحانی اذیت اور انفعال حاصل ہوا ہے کیا تھوڑا ہے؟

تو اگر اسوقت کوئی کوئی صلیب پرست فلاسفر جواباً یہ عرض کر سکتا ہے کہ ایڈریانوپل کی فتح سے جو مادی نقصانات ہم کو برداشت کرنا پڑے ہیں اُن کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ اور آپ اس پہلو کو کیوں نظر انداز کر رہے ہیں؟ تو کیا رب ذو الجلال کے دربار میں جسم کی طرف سے کوئی وکیل یہ نہیں کہہ سکتا کہ

دنیا کے سرد و گرم، تر و خشک خیر و شر میں جب جسم روح کے برابر شریک تھا۔ تو کیا وجہ ہے۔ کہ اب جسم کو ان لذایذ سے تمتع کا کوئی موقعہ نہیں دیا جاتا۔ جس طرح ایڈریا نوپل فتح کے بعد تلوار سے ہی واپس لیا جا سکتا ہے اور فاتح نقطہ روحانی مسرت پہ اکتفا نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ جسمانی پہلو سے بھی حظ اندوزی کا طلبگار رہے۔ بالکل اسی طرح حیات بعد الممات میں بھی جسم روح کے دوش بدوش ہوگا۔ اور اپنے حقوق کے لئے داد فریاد کریگا۔ اور کوئی بھی ایسا نہ ہوگا۔ جو صرف روحانی مسرت کے کھلونے سے بہل جائے۔

اسلام نے راہبانہ زندگی سے اپنے پیرؤوں کو اسی لئے منع فرمایا۔ کہ وہ جسمانی پہلو کو نظر انداز کرکے لذایذ دنیا سے تنفر ظاہر کرتے ہیں حالانکہ اس حکیم علی الاطلاق کا انسانی تخلیق سے بالکل یہ مدعا نہ تھا۔ کہ وہ اپنے اس قدر اہم بالشان حصہ کو نظر انداز کر دے، بلکہ یہ تعلیم دی جاتی ہے۔ کہ ہم نہایت فراخدلی سے جائز طور پر لذایذ دنیوی سے بہرہ ور ہوں اور نہایت شد و مد سے ہم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ کہ

الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ولیمکنن لهم دینهم الذی ارتضیٰ لهم ولیبدلنهم من بعد خوفهم امنا (۱۸ - نور)

وعدہ الٰہیہ کے پہلے جزو میں ہم کو ایک مادی چیز عنایت فرمائی جاتی ہے۔ جس سے ہمارے جسمانی پہلو کی رعایت مقصود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس معجون (انسان) میں غالباً جسمانی پہلو روحانی پہلو سے زیادہ قابل اہتمام ہے۔ وعدے کا دوسرا جزو روحانیت اور جسمانیت دونوں سے مرکب ہے اور تیسرا خالص روحانی ہے۔ لیکن یہ امر کس قدر تعجب انگیز ہوگا۔ کہ حیات بعد الممات میں جسمانی پہلو کو بالکل بھلا دیا جائے، اور ایک نہ ختم ہونے والی زندگی روحانی (فرضی) مسرتوں میں بسر کرنا پڑے۔ اسی طرح حیات بعد الممات میں اگر جسمانی پہلو بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔ تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام راہبانہ زندگی کے برخلاف کیوں زور شور سے پروٹسٹ کر رہا ہے۔ حالانکہ جب آخری زندگی سراپا روحانی مسرتوں اور اذیتوں سے لبریز ہے تو اس شخص کو کیوں قابل تحسین و آفرین نہیں خیال کیا جاتا۔ جو اپنی دنیوی اور اخروی زندگی میں مماثلت پیدا کرنے کو شش کرتا ہے۔

نبی اور مرسل کو روح القدس سے جو قریب کا تعلق ہوتا ہے وہ کسی اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔ لیکن جسمانی لذایذ کچھ اس قدر دلربا واقع ہوئے ہیں کہ وہ بھی باقاعدہ ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ حالانکہ جب اخروی زندگی بالکل ہی روحانی زندگی ہے۔ تو کیا یہ قرین قیاس نہیں کہ پیغمبر اس زندگی کا مکمل

نونہ ہوتا ہے، جبکہ نبی کی بعثت کا مقصود بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو اس سفر کے لئے تیار کرے۔ لیکن سنئے، دنیا کا سب سے بڑا انسان کیا کہہ رہا ہے۔

حُبِّبَتْ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ ثَلَاثَۃٌ - اَلطِّیْبُ، وَالنِّسَاءُ، وَقُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ -

یہاں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح ترتیب مدارج منظور ہے (۱) عورت (۲) طیب (۳) الصلوۃ اگر بہشت دوزخ روحانی مسرت و اذیت کی دوسری تعبیریں قرار دی جائیں تو کیا یہ سراپا ابلہ فریبی نہیں کس قدر مضحکہ خیز امر ہے کہ اسد کہہ کر رجل شجاع مراد ہو اور اس تاویل کے لئے ذرا بھر بھی گنجائش نہ ہو اور نہ کوئی قرینہ صادقہ موجود ہو۔ روحانی مسرتوں اور اذیتوں کو حور و قصور، اور دوزخ زہا دیے تعبیر کرنا معنی الشعر فی بطن الشاعر کے قبیل سے ہے۔

بہ کروڑ مسلم آبادی میں اسوقت فی لاکھ کتنے آدمی ایسے ہوں گے، جن کا یہ عقیدہ ہے کہ بہشت و دوزخ سے مراد روحانی مسرت و اذیت ہے عوام جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے۔ ہرگز جسمانی پہلو کو نظر انداز کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اگر وہاں بقول آپ کے روحانی مسرتوں اور اذیتوں کا ہی انتظام ہے تو عوام جن کی ساری عمر دوزخ کے ڈر اور بہشت کے شوق میں بسر ہوئی، خدائے متعال کی اس ابلہ فریبی کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جبکہ اُنکی پیاس بجھانے کے واسطے کافی سامان نہ ہونگے اور کیا اس وقت کہا جا سکتا ہے کہ بہشت و دوزخ سے مراد روحانی مسرت اور اذیت تھی۔ اگر کسی نے کہہ بھی دیا تو کیا ادھر سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ

تکلم الناس علی قدر عقولھم۔

ممکن ہے۔ آپ یہ فرما دیں کہ قرآن نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون

لیکن اسوقت اگر اہل الذکر کی کسی کو جستجو بھی ہو تو ۸ کروڑ مسلم آبادی سے کتنے آپ کے ہم خیال اہل الذکر پیدا ہوں گے ہاں پھر ارشاد ہے کہ

فاتبعوا السواد الاعظم اور

ولا تجتمع امتی علی الضلالۃ

غلام ربانی عزیز

(نگار) یہ استفسار یا اعتراض مولوی غلام ربانی عزیز کا دو سال سے میرے پاس سے محفوظ ہے اور اس درمیان میں بار ہا میری نظر سے گذرا، لیکن ہمیشہ "میں نے موقوف اسے وقت دگر پر رکھا" ایک زمانہ سے میرے اوقات کا اکثر حصہ اسی غور و فکر میں بسر ہو رہا ہے

کہ خالق و مخلوق کا تعلق کس نوع کا ہوسکتا ہے تخلیق انسان کی غایت کیا ہے؟ قدرت ہم سے کیا توقعات رکھ سکتی ہے۔ اور مذہب کس حد تک اس معمہ کے حل کرنے میں کامیاب ہوا ہے، پھر اسی ایک خیال کے ماتحت چونکہ طاعات و عبادات کے مسائل، معاد و آخرت کے عقاید انبیا و رسل کے الہامات، عالم کون کے سلسلہ ہائے علت و معلول، اور وہ تمام باتیں جو ایک مذہبی لٹریچر سے متعلق ہوسکتی ہیں سبھی پر غور کرنا پڑا اس لئے ظاہر ہے کہ بہشت و دوزخ کے قصے بھی میرے سامنے آئے ہوں گے اور میں نے اُن کے متعلق بھی کوئی رائے قائم ہوگی، لیکن میں خود ایک عرصہ تک اس باب میں متفکر و متردد رہا اس لئے جی نہ چاہا کہ بغیر خود اپنا اطمینان نفس حاصل کئے بغیر دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کروں۔ قبل اس کے کہ میں اصل مقصود پر آؤں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا مسلمان ہونا (اگر میں واقعی مسلمان ہوں) اس بنا پر نہیں کہ میرے آبا و اجداد اس مذہب کے پیرو تھے۔ بلکہ مسلمان ہوں اسلئے کہ میں نے تمام مذاہب کے لٹریچر کا نہایت غایر اور وسیع مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اگر انسان کو مذہب کی ضرورت ہی تو اسلام سے بہتر کوئی اور مذہب اس کے لئے نہیں ہوسکتا کیونکہ اس سے زیادہ سادہ، لیکن ہمہ گیر تعلیمات کہیں اور نہیں پائی جاتیں پھر ظاہر ہے کہ اس صورت میں میرا اسلام کوئی تقلیدی چیز نہیں ہے اور نہ تقلید محض ایک شخص کو کسی مسلک یا مذہب کا سچا پیرو بنا سکتی ہے "نفس مطمئنہ" نام کورانہ اتباع کا نہیں، بلکہ اجتہادانہ تفکر و تدبر کا ہے اور یقیناً اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہر شخص کو ہر زمانہ میں تنقید کی دعوت دے سکتا ہے اور کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ بغیر غور کئے ہوئے اس کی تعلیمات کو قبول کرے۔

بہرحال مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس سلسلہ میں، جہاں اور بہت مسائل پر غور کرنا پڑا، میں نے اس خاص مسئلہ پر بھی نہایت آزادانہ رائے قائم کرنے کی کوشش کی اور اگر مجھے اندیشہ نہ ہو کہ لوگ میرے مفہوم کے سمجھنے میں غلطی کریں گے تو میں نہ صرف یہ کہونگا کہ بہشت دوزخ اصطلاحی الفاظ ہیں روحانی لذت و الم کے لئے بلکہ یہ دعویٰ کرونگا کہ اس مخصوص معنے کے لحاظ سے بھی معاد کا اعتقاد بالکل بے معنی سی بات ہے، اور گو اس کے وعظ و تلقین ایک عامی شخص کی صحت اخلاق کے لئے ضروری ہو لیکن ارباب فہم کے لئے اسکی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی

ہر چند معاد کے مسایل ایسے نہیں ہیں جنپر اس سے قبل کوئی گفتگو نہ کی گئی ہو، کیونکہ مذاہب کے قیام و بقا کا انحصار ہی اسپر ہے اور ہر وقت اور ہر قوم میں اسپر بحث کی گئی ہے، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ یہ مسئلہ بھی منجملہ ان بہت سے مسائل کی ہے جن پر تا بقاء نسل انسانی ہمیشہ گفتگو کی جائے گی اور ہمیشہ اختلاف آراء پایا جائے گا۔ اس لئے میرا اس مسئلہ پر اظہار خیال کسی جدید بحث کا آغاز تو نہ ہوگا لیکن یہ یقینی ہے کہ جو کچھ لکھونگا وہ میری تحقیقی رائے ہوگی، میرے نقطۂ نظر سے بالکل پُرخلوص رائے ہوگی، خواہ وہ معتقدات عامہ سے کتنی ہی منحرف کیوں نہ ہو۔ مسئلہ عذاب و ثواب یا بہشت و دوزخ پر گفتگو کرنا اس قدر کثیر ذیلی مباحث کا پیدا کرنیوالا ہے کہ اس کے لئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے، لیکن چونکہ میرا اشعار تمام مذہبی مسائل میں صرف "تمسک بالقرآن" ہوتا ہے اسلئے میں کوشش کرونگا کہ مختصر سے مختصر مقالہ میں اپنے خیالات کا اظہار کروں اور اس بحث کے دیگر "انشعابات" پر اگر نگاہ ڈالنا ضروری ہو بھی تو صرف سرسری نگاہ سے کام لوں۔

سب سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسئلہ معاد کوئی نئی چیز نہیں ہے اور قدیم ترین مباحث انسانی میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم قدیم ایام سے ایسی نہیں گزری جس نے اپنے مدارک و مدارج ذہنی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ عالم بعد الموت پر فکر نہ کی ہو اور مذہب کے وجود کی بنیاد اس خیال پر نہ قائم کی گئی ہو کہ اس دنیا کے بعد ایک عالم اور بھی ہے جہاں محاسبۂ اعمال ہوگا۔ عذاب و ثواب ہوگا، بہشت و دوزخ ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

مذہب کیونکر عالم وجود میں آیا، یہ اب کوئی سربستہ راز نہیں رہا اور نہ اس کی غایت کا علم اب پردۂ خفا میں ہے۔ قانون و مذہب میں مقدم وجود قانون ہی کا ہے لیکن واضعین قوانین نے دیکھا کہ اس سے فسادات کا سد باب پوری طرح ممکن نہیں ہے تو انھوں نے مذہب کو پیدا کیا تاکہ انسان کی طبیعت ہی صلاحیت پسند ہو جائے اور قلب انسانی میں بھی خطرۂ جرم نہ آوے۔ تصفیۂ اخلاق، تزکیۂ نفس، نظام تمدن، تشکیل ہیئت اجتماعی یہی وہ سب باتیں تھیں جو قانون کے بھی پیش نظر تھیں لیکن جب وہ ان کے حصول میں کامیاب نہ ہوا تو مذہب پیدا کیا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ تدبیر اختیار نہ کی جاتی تو آج بھی دنیا اسی عہد وحشت و بربریت میں ہوتی جو کسی وقت اس سے قبل پایا جاتا تھا۔ تکلیف سے بچنا، آرام و راحت کی طرف دوڑنا، فطرت انسانی ہے، اس لئے اگر اس فلسفہ کو پیش نظر نہ رکھا جاتا اور مذہب کو اس سے بیگانہ رکھا جاتا تو وہ بالکل بیجان چیز رہتا اور مقصود حاصل نہ ہوتا، اس لئے مذہب کی بنیاد یہی معاد کے خیال، عذاب کے ڈر اور ثواب کی تمنا پر قائم کی گئی، پھر چونکہ اس اعتقاد کے لئے ضروری تھا کہ انسان کی حیات ثانیہ کو بھی ثابت کیا جائے (کیونکہ بغیر اس کے عذاب و ثواب کا مفہوم کوئی اہمیت نہ رکھ سکتا تھا) اس لئے حشر اجساد اور بقاء روح کو ضروری قرار دیا گیا۔ یہ تھی مذہب کی بالکل ابتدائی تحریک جس کو میں انتہائی بھی کہونگا، کیونکہ اس وقت بھی مذہب نہیں کا تار و پود اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

روح کیا ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ آج تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا اور نہ شاید کبھی ہو سکے۔ اس پر مستقل تصانیف روز شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے جس کو دیکھ کر کسی شخص کو اطمینان کلی ہو سکے۔ میں اس صحبت میں تمام اکابر و اعاظم کی تحقیق سے بحث نہیں کرونگا، بلکہ غور کرونگا کہ کلام مجید میں اس کے متعلق کیا بتایا گیا ہے۔

غالباً آپ یہ سن کر متحیر ہوں گے کہ شروع سے لیکر اس وقت تک تمام مفسرین نے اس باب میں سخت غلطی کی ہے اور کلام مجید کی اُن آیتوں سے جن میں لفظ روح پایا جاتا ہے، مسئلہ روح کے حل کرنے میں مدد لی ہے، حالانکہ "روح انسانی" کے لئے جس کا تعلق حیات و ممات سے ہے، ایک جگہ بھی کلام پاک میں روح کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔

لفظ روح قرآن پاک میں ہر جگہ "الہام" اور "قوت رشد و ہدایت" کے لئے آیا ہے۔ میں اس جگہ ان تمام آیات کو نقل نہیں کرونگا جنہیں لفظ روح استعمال کیا گیا ہے بلکہ سورۂ مومن کی صرف ایک ایسی آیت پیش کرونگا جس سے یقینی طور پر یہ امر ثابت ہو سکتا ہے کہ لفظ روح سے خدا کا کیا مفہوم ہے وہ آیت یہ ہے:۔

رفیع الدرجات ذوالعرش یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ لینذر یوم التلاق۔

یعنی بلند مرتبہ والا، صاحب قوت (خدا) ڈالتا ہے روح (پیدا کرتا ہے قوت رشد وہدایت) اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے تاکہ وہ ڈرائے انجام سے۔

اگر روح سے مراد روح انسانی ہوتی تو پھر یہ تخصیص کیونکر ممکن تھی کہ "جس بندہ کو چاہتا ہے یہ روح عنایت کرتا ہے" روح انسانی تو ہر آدمی میں پائی جاتی ہے اور اس سے کوئی خالی نہیں، اس لئے معلوم ہوا کہ روح سے مراد خدا کا الہام یا قوت رشد و ہدایت ہے۔

اسی پر قل الروح من امر ربی کا بھی قیاس کر لیجئے۔ یہاں روح سے قرآن مراد ہے یسئونک عن الروح (یعنی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ قرآن جسے تم الہامات ربی کہتے ہو کیا ہے) قل الروح من امر ربی (تو اس کے جواب میں اے رسول تم کہدو کہ یہ الہامات سب حکم خداوندی و منشار ایزدی کا نتیجہ ہیں) وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (جس کے سمجھنے کی اہلیت تم میں بہت کم ہے۔)

آپ قرآن پاک کھول کر سورۂ بنی اسرائیل میں، اس آیت کے قبل و بعد کی آیتوں پر غور کیجئے، آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ روح سے مراد کیا ہے۔

اسی طرح سورۂ النحل کی ایک آیت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ لفظ روح سے روح انسانی مراد نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ (یعنی تو ار ملکوتی حکم خداوندی سے الہامات پیدا کرتے ہیں اپنے مخصوص بندوں میں) یہاں بھی وہی علی من یشاء ہے۔ ہر انسان مقصود نہیں ہے۔ اسی طرح مسیح کے بیان میں نفخ روح سے جو مراد ہو سکتی ہے ظاہر ہے بہرحال روح انسانی کے لئے کلام مجید میں لفظ روح کسی جگہ نہیں آیا ہے اور اس کے سمجھنے میں تقریباً سب نے غلطی کی ہے، اس لئے اب غور طلب یہ امر ہے کہ اگر لفظ روح، روح انسانی کے لئے نہیں آیا ہے تو پھر اس معنی میں کس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے بعض کا خیال ہے کہ اس کے لئے لفظ نفس استعمال کیا گیا ہے، لیکن مجھے اس سے بھی اختلاف ہے۔ میرے نزدیک کلام مجید میں نفس کا لفظ ضمیر یا (Conscience) کے مفہوم میں آیا ہے۔

سورۂ قیامت میں ہے "ولا اقسم بالنفس اللوامۃ" سورۂ الفجر میں ہے یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ سورۂ شمس میں ہے ونفس وما سواہا۔ ان میں سے ہر جگہ نفس سے مراد ضمیر انسانی ہے۔ اور اگر نفس سے مراد واقعی روح انسانی مراد ہوتی تو اس مفہوم کے علاوہ کسی اور معنی میں یہ لفظ استعمال نہ ہوتا، حالانکہ ظاہر ہے کہ کل نفس ذائقۃ الموت میں نفس سے مراد روح انسانی نہیں بلکہ دنیاوی ہستی مراد ہے۔

الغرض میری جستجو کا نتیجہ یہ ہے کہ کلام مجید میں نہ روح کی حقیقت سے کہیں بحث کی گئی ہے اور نہ اس کی فنا یا بقا کا جھگڑا چھیڑا گیا ہے، اگر روح کا بقا ثابت ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار کلام مجید نہیں ہے، اور اگر روح فانی ثابت ہوتی ہے تو قرآن کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر حیات بعد الموت کو مذہباً تسلیم کیا جاتا ہے اور حیات بھی بالکل ویسی ہی جیسی اس دنیا میں پائی جاتی ہے یعنی جسم کے ساتھ تو از روئے نتیجہ یہ ماننا ضروری ہوگا کہ نہ صرف روح انسانی بلکہ انسانی جسم بھی غیر فانی چیز ہے، حالانکہ جسم کی بقا کا

کوئی قایل نہیں - اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ جسم از سر نو پیدا کیا جائے گا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ روح کا دوبارہ پیدا ہونا بھی ناممکن نہیں ہے، جس طرح اول اول جسم کے ساتھ روح پیدا ہوئی تھی، اسی طرح بعد کو بھی جب جسم پیدا ہوگا روح بھی اُس کیساتھ وجود میں آجائے گی - اس لئے وہ جماعت جو حشر اجساد کے قایل ہے کسی طرح روح کی بقا کو دلایل عقلی سے ثابت نہیں کر سکتی -

بہرحال قبل اس کے حشر اجساد پر بحث کی جائے، یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ آیا معاد کا اعتقاد محض لوگوں میں خشیت پیدا کرنے اور اُن کے اخلاق درست کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے یا حقیقتاً عقل کے نزدیک بھی وہ قایل قبول ہے - آئیے پہلے ایک نظر اس سوال پر بھی ڈال لیں - جس وقت ہم کائنات اور عالم خلق پر نگاہ ڈالتے ہیں تو سب سے پہلی وہ چیز جو ہماری عقل کو حیران بنا دیتی ہے اس کی وسعت و تنوع ہے - کائنات نام اُس کرۂ ارض کا نہیں جس کا دور صرف ۲۴۰۰۰ میل ہے اور جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک معمولی سیارہ ہمارے نظام شمسی کا ہے، بلکہ کائنات اور عالم خلق میں تمام وہ فضاء بسیط شامل ہے جس کی وسعت کا کا اندازہ نہیں ہو سکتا جنھوں نے فلکیات کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ امر مخفی نہیں کہ ہمارا نظام شمسی کیا ہے؟ اس میں علاوہ زمین کے اور بڑے بڑے سیارے (عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل وغیرہ) بھی ہیں ان سیاروں کے چاند بھی ہیں چھوٹے چھوٹے ستارے بھی ہیں بیشما شہاب ثاقب اور دمدار ستارے بھی پائے جاتے ہیں اور مختصراً یوں سمجھئے کہ نظام شمسی کا محیط ۱۱ ارب میل ہے لیکن باوجود اس قدر عظمت کے یہ سارا نظام شمسی کائنات کی وسعت کے لحاظ سے اس قدر حقیر چیز ہے کہ اگر اسکو آج محو کر دیا جائے تو کائنات کو اتنا بھی نقصان نہیں پہونچ سکتا جتنا سمندر کو ایک قطرہ کے نکل جانے سے" (باقی)

نیاز

ہندوستانی ایکاڈمی

صوبہ متحدہ نے کچھ رقم اس غرض سے علحدہ کر دی ہے کہ اس سے ان اردو اور ہندی کتابوں کی طبع و اشاعت کرے جنکو ایکاڈیمی منظور کریگی - کتابیں خواہ کسی فن کی ہوں - جو لوگ اپنی کتابیں چھپوانا چاہتے ہوں ان کو اپنے مسودے ایکاڈیمی میں بھیجنا چاہئے اور طے کرنا چاہئے کہ کن شرطوں پر وہ اشاعت کے لئے دینا چاہتے ہیں - مسودہ بالکل مکمل صورت میں اس طرح ہو کہ ایک صفحہ پر لکھا ہو اور دوسرا سادہ رہے -

مسودہ دفتر میں ۳۱ اگست سنہ ۲۸ء تک پہونچ جائے

جنرل سکریٹری

ہندوستانی ایکاڈیمی - (الہ آباد)

معلومات

ہوائی تجارت

اس وقت انگلستان میں ایک ہوائی جہاز ایسا طیار ہو رہا ہے جس کی لمبائی ۷۰۹ فٹ ہوگی اور قطر ۱۳۳ فٹ اس کے ہیکل (Body) کے ڈھکنے کے لئے ۳۳۵۰۰۰ مربع فٹ کپڑا درکار ہوگا اس کا ہیکل المیونیم کا بنایا جائے گا۔

اس میں چھ بڑے موٹر رولز رایس کے ہوں گے جن کی قوت ۶۵۰ گھوڑوں کی ہوگی اور چھوٹے چھوٹے موٹر ان کے علاوہ ہونگے اس کے درمیان میں کمرے ہوں گے جن میں ۹۰۰ مسافر بیٹھ سکیں گے چالیس آدمی اس کے چلانے والے ہوں گے۔ کھانے کے کمرے میں بیک وقت ۵۰ آدمی کھانا کھا سکیں گے۔

اسی طرح فریڈرکیہافن میں بحیرۂ کونسٹانس پر ایک جہاز اہل جرمن طیار کر رہے ہیں جن کی لمبائی ۷۶۳ فٹ ہوگی اور قطر ۹۷ فٹ اس کی رفتار ۸۰ میل فی گھنٹہ تک ہوگی اور ایک مرتبہ اڑ کر ۶۲۵۰ میل تک برابر بغیر وقفہ کے سفر کر سکیگا۔ اس کے موٹر پانچ ہیں جن کی قوت ۵۳۰ گھوڑوں کی ہوگی۔ آئندہ موسم بہار میں یہ جہاز برلن سے امریکہ کا سفر کریگا۔

کُہر کا دشمن

امریکہ کی ایک برقی کمپنی نے ایک خاص قسم کے گیس سے قرمزی رنگ کی روشنی پیدا کی ہے جو کُہر کو منور کر دیتی ہے، ایک دن صبح کو جب کہ کُہر کی کثرت سے نظر بیکار ہو گئی تھی، یہ روشنی پیدا کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصف میل تک کُہر غائب ہو گیا اور ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔

یہ ایجاد ہوائی جہازوں کے لئے بڑی نعمت ہے کیونکہ ان کا سب سے بڑا دشمن کُہر ہے جو فضا کو اُن کے لئے بالکل ناقابل سفر بنا دیتا ہے۔

کائنات کی وسعت

روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی منٹ ہے اور یہی رفتار لاسلکی امواج کی ہے۔ اس لئے تقریباً سات منٹ میں روشنی سارے کرۂ زمین کا چکر لگا لیتی ہے۔ لیکن کائنات کی وسعت کا اندازہ اس سے کرنا چاہئے کہ اسی روشنی کو جو ایک منٹ میں تقریباً دو لاکھ میل کا سفر کر لیتی ہے اس کو ایک کرور سال کائنات کا دورہ کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ یا دوسری طرح اس وسعت کا اندازہ یوں کیجئے کہ اگر سارے کرۂ ارض کو مختصر کر کے ایک نہایت قصر جوہر فرد (ذرۂ لایتجزیٰ) میں تبدیل کر دیا جائے تو عالم کو اسی نسبت سے پورے کرۂ ارض کے برابر ماننا پڑے گا۔

مسلک نسبیۃ (Relativity) میں اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں کہ اگر ایک ارب کُرے زمین کے برابر فضا میں گردش کرتے ہوئے تسلیم کئے جائیں تو بھی کائنات کی وسعت کا ایک گوشہ ان سے نہیں بھر سکتا۔

سورج زمین سے حجم میں ۱۰ لاکھ گنا اور جرم میں تین لاکھ گنا بڑا ہے۔ سورج کے تابع جتنے اور اجرام فلکی ہیں اُنکا اندازہ ۳۰ ہزار

ملین کیا جاتا ہے۔ پھر یہی چھوٹے چھوٹے ستارے فضا کے اندر نہیں ہیں بلکہ ہر سدیم یا تو اسی طرح کا نظام شمسی رکھتا ہے یا زمانہ کی گردش کے بعد رکھنے والا ہے۔

پھر سدیم کی وسعت کا اندازہ کس سے ہو سکتا ہے جس کے اندر اس قدر مادہ پایا جاتا ہے کہ اس سے کروروں آفتاب بن سکتے ہیں اور جو اس قدر لطیف ہے کہ ایک اونس کا دس لاکھواں حصہ ۱۵ ہزار فٹ بلند پہاڑ کے برابر جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہبل کا بیان ہے کہ اس وقت ۲۰ لاکھ سدیم کا اس طرح کی دوربین سے دیکھے گئے ہیں اور وہ فضا جو دوربین کی حد سے باہر ہے اس سے ایک ارب گنا زائد ہے۔ اگر سدیم کی تعداد فضا میں کم سے کم دس کھرب ہو اور ہر سدیم میں ایک ہزار ملین ستارے ہوں تو فضا کے تمام ستاروں کی تعداد کم سے کم ۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ہوگی

اس کے بعد دیکھئے کہ ہمارا کرۂ کائنات میں کیا اہمیت رکھ سکتا ہے۔

نوبل پرائز

سویڈن کے ایک مشہور علم الکیمیا نے جس کا نام نوبل تھا ڈائنامیٹ بنانے سے بے اندازہ دولت کمائی تھی سنہ ۱۸۹۶ء میں اپنے مرنے سے قبل اس نے اپنی اکثر دولت سالانہ پانچ انعاموں کے لئے وقف کر دی اور چالیس ہزار گنی ہر انعام کی رقم مقرر کرکے وصیت کر دی کہ مختلف علوم کے ماہرین کو یہ انعامات دئے جائیں۔

اول مرتبہ سنہ ۱۹۰۱ء میں نوبل کی وفات کے ۵ سال بعد انعام دئے گئے طبعیات میں پروفیسر رنٹجن کو، کیمیا میں وانٹ ہوا کو، طب میں ڈاکٹر بہرنگ کو اور ادب میں سلی برودوم کو

اس وقت تک ۲۷ مرتبہ ۱۳ امردوں اور ۴ عورتوں کو یہ انعام مل چکا ہے، جن میں سے ۲۴ انعام طب و فزیالوجی کے لئے ۲۳ طبعیات کے لئے، ۲۳ کیمیا کے لئے، ۲۶ ادب کے لئے اور ۱۲۸ امن کی سعی کرنے والوں کے لئے تھے۔

ان میں سے اہل جرمنی نے تیس انعام حاصل کئے جن میں زیادہ تر کیمیا اور طبعیات سے متعلق تھے، اہل فرانس نے ۲۴ انعام حاصل کئے، اہل انگلستان نے اکیس، اہل سویڈن نے ۹، اہل امریکہ نے ۸، سوئٹزرلینڈ والوں نے ۷، ڈنمارک اور ہالینڈ والوں نے چھ چھ، اسپین نے ۲، پولینڈ نے ۲، روس نے ایک، ہندوستان نے ایک، اور ناروے، بلجیم، اٹلی اور اسٹریا نے چار چار انعام حاصل کئے۔

ادب کے انعامات میں برطانیہ، فرانس، جرمنی نے چار چار، اسپین، ڈنمارک، سویڈن، ناروے اور پولینڈ نے دو دو انعام حاصل کئے، سعی امن کے انعامات میں سب سے زیادہ فرانس کو ملا اور پھر سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کو

خاتونوں میں سے میڈم کوری کو دو انعام طبعیات اور کیمیا کے ملے، سویڈن کی ایک خاتون سلمی لجرلوف کو ادب میں انعام ملا، اور سعی امن کا انعام بھی ایک اور خاتون کو دیا گیا۔

کیڑوں کا احساس الم

بعض کیڑوں میں ایسے دقیق و نازک اعصاب پائے جاتے ہیں جن کے ذریعہ سے وہ بعض ایسی کیفیات کو محسوس کر لیتے ہیں جن کو اعصاب انسانی محسوس نہیں کر سکتے۔ مثلاً چیونٹی فوق البنفسجی رنگ کو

بھی دیکھ لیتی ہے اور ہم نہیں دیکھ سکتے

بعض کیڑوں میں چھونے کی ایسی قوت موجود ہے کہ اس کی نزاکت کا تصور بھی انسان کو نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود اسکے بعض علماء کا حال ہے کہ تکلیف کا احساس ان میں نہیں ہے

چنانچہ فرانس کے ایک عالم اوگسٹ خوال نے اس کا تجربہ کرنے کے لئے ایک شہد کی مکھی کا اگلا حصہ سر کا سوائے آنکھوں اور منہ کے قینچی سے کاٹ دیا اور چھوڑ دیا اس کے بعد اس نے دیکھا کہ مکھی پھر پھولوں کی طرف اڑ کر گئی اور اس کو چوسنے کی بیکار کوشش میں مصروف ہو گئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اُس کو اپنے مقدم حصۂ سر کے قطع ہونے کا کوئی احساس نہ تھا۔

اسی طرح اس نے ایک مکھی پکڑی اور اس کے جسم کا پچھلا حصہ بیچ سے کاٹ دیا اُس کے بعد بھی وہ نہ صرف زندہ رہی بلکہ غذا بھی کھاتی رہی اور اس حال سے بےخبر تھی کہ جو غذا اسکے پیٹ میں جاتی ہے وہ سینہ سے ہو کر پھر زمین پر گر جاتی ہے۔ اسی طرح اور بھی متعدد تجربوں سے بعض کیڑوں کے عدم احساس الم کو ثابت کیا گیا ہے۔

دو عجیب و غریب ایجادیں

امریکہ کے ایک ماہر برقیات ونزلی نے ایک عجیب و غریب آلہ ایجاد کیا ہے جس کا نام اس نے (Televox) رکھا ہے یہ آلہ حقیقتاً ایک مستقل خادم ہے اور زندہ انسان کی طرح کام کرتا ہے۔ اس مصنوعی انسان کے ہاتھ بھی ہیں، کان بھی ہیں اور وہ ان سے وہی کام لیتا ہے جو ایک انسان کر سکتا ہے

اس انسان کے مختلف اعضا، لاسلکی امواج سے مختلف صورتوں میں متاثر ہوتے ہیں اور ان سے وہی افعال ظہور میں آتے ہیں جو انسان سے ظاہر ہونے چاہئے۔ دوسرے آلہ کا نام (Integraph) ہے یہ آلہ ایک بڑے ریاضی داں انسان کی خدمت انجام دے سکتا ہے۔

اس وقت تک ریاضی کے متعلق جو آلے ایجاد ہوئے تھے وہ صرف یہی کر سکتے تھے کہ معمولی رقموں کو جوڑ دیں، ضرب و تقسیم کا معمولی جواب نکال دیں۔ لیکن یہ آلہ نہایت مکمل ہے اور ریاضی کے تمام پیچیدہ سوالات حل کر سکتا ہے۔

مصنوعی حنجرے

سر رچرڈ نے اپنے ایک لکچر کے دوران میں میز پر مقوی کے متعدد ٹکڑے رکھے، جو انسان کے حنجرہ کی صورت کے تھے انیں متعدد نلکیاں لگی ہوئی تھیں جن کا تعلق ایک دھونکنی سے تھا جس کو سر رچرڈ کی لڑکی دھونکتی تھی۔ ان مصنوعی حنجروں میں ہر ایک سے مختلف حروف کا تلفظ مختلف لب و لہجہ کے ساتھ پیدا ہوتا تھا۔ یہ حنجرے بالکل اسی اصول پر بنائے گئے تھے جو انسانی حنجروں کی ساخت سے متعلق ہے۔

اگر ان حنجروں کو اس مصنوعی انسان سے ملا دیا جائے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے تو پھر یقیناً ایک ایسا انسان پیدا ہو سکتا ہے جس کی انسانیت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔

ایک شاعر کا انجام ۱۲ر　نگارستان عہ　شہاب کی سرگزشت۔ عہ ر　ملنے کا پتہ: مینجر نگار لکھنؤ

نمائندہ نگار کی ڈائری

۱۱ اپریل کو کاشانہ مصطفا میں محمد ادریس صاحب سے جو بریلی کے رئیس ہیں اور ایک مشہور کارخانۂ فرنیچر کے مالک ہیں ملاقات ہوئی آپ نے ایک سال کیلئے نگار کی خریداری منظور فرمائی۔ قریب ۳ بجے کے مصطفا صاحب سے رخصت ہو کر دفتر پہنچا۔ مولانا نیاز بہت مصروف تھے تاہم وقت نکال کر سفر کا پروگرام بنایا۔ مولانا نے کچھ خطوط لکھ کر دئے آج شام ہی کو روانہ ہوا لیکن گاڑی نہ مل سکی اور واپس دفتر آگیا۔ آسی صاحب افسر صاحب و مولانا نیاز کہیں جانے ہی والے تھے۔ میں بھی شوکت صاحب کے ساتھ وقت کاٹنے نکل گیا جو مجھے پہونچانے اسٹیشن تک گئے تھے۔ رات کو قیام گاہ پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ مولانا ہنوز واپس نہیں آئے، ملازم نے فوراً میز پر کھانا لگا دیا کھانے کے بعد کچھ چہل قدمی کی اور پھر سوگیا۔— ۱۲ اپریل۔ ملازم نے آج معمول سے پہلے مجھے جگا دیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر سامان ٹھیک کیا۔ ملازم تانگہ لے آیا۔ مولانا سے چلتے وقت ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہا۔ بالکل صحیح وقت پر اسٹیشن پہنچا۔ (کانپور) کا ٹکٹ لیا۔ اتفاق سے جس گاڑی میں بیٹھا۔ اسی میں جناب ہادی مچھلی شہری تشریف فرما تھے۔ بہت عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی۔ ہادی صاحب کے ذریعے وحیدالدین صاحب سوداگر سے تعارف ہوا وحید صاحب نے (کانپور) پہنچکر نگار کی خریداری کا وعدہ فرمایا۔ مجھ سے قریب ہی جناب ارشاد حسین صاحب تشریف رکھتے تھے صاحب موصوف شروع ہی سے ہمارے پرچے کے معاون ہیں ۲۷ء میں خریداری کا انقطاع ہو گیا تھا میری گزارش پر اپریل ۲۸ء سے پھر خریداری منظور فرمائی ۹ بجے کے قریب (کانپور) آگیا۔ تانگہ لیا۔ مولوی عبدالرؤف صاحب ڈپٹی کلکٹر کے بنگلہ پر پہنچا ایک خط مولانا نیاز کا ڈپٹی صاحب کے نام تھا۔ ملازم سے معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب کہیں معائنہ کے لئے گئے ہیں۔ ملازم نے اسباب ٹھیک کیا۔ میں نہا کر کچھ غیر ارادی طور پر سو گیا ۱۲ بجے ملازم نے کھانے کے لئے جگا دیا۔ میں کھانا کھا ہی چکا تھا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لائے مجھے یہ معلوم ہوا گویا میں کسی فرشتہ سے مل رہا ہوں۔ ڈپٹی صاحب کو کچہری جانا تھا اسلئے وہ مجھ سے جلد رخصت ہو گئے میں بھی کچہری پہنچا۔ بابو کرشن سہائے صاحب وکیل سے ملا وکیل صاحب نہایت خلق سے پیش آئے۔ ۱۳ اپریل۔ فراش خانہ پہنچا محب اللہ صاحب نے نگار کی توسیع اشاعت میں بہت کچھ حصہ لیا۔ اور بہت صاحبوں سے میرا تعارف کرایا عبدالحمید صاحب نے بھی بہت دلچسپی لی عبدالغفار صاحب برادرس اور وحید الحسن صاحب وکیل نے ایک ایک سال کی خریداری شروع سال سے منظور فرمائی۔ ۱۴ اپریل میاں محمد بشیر صاحب بیرسٹر و میاں محمد نظیر صاحب نے زر سالانہ مرحمت فرمایا۔ فضل حسین صاحب اڈیٹر البرید نے اسلامیہ یتیم خانہ لائبریری کے لئے رعایتی قیمت پر ایک سال کے لئے رسالہ جاری کرایا۔ ۱۵ اپریل۔ وحیدالدین صاحب بھی ایک سال کے لئے خریدار ہو گئے اسی دن حلیم مسلم لائبریری کے لئے رعایتی قیمت پر ایک سال کے لئے رسالہ جاری کیا گیا۔ حافظ عبداللطیف نے زر سالانہ مرحمت فرمایا اور حاجی محمد داؤد خاں صاحب سوداگر چرم کے ایک خصوصی کارکن صاحب نے ایک سال کے اجرا کی اجازت دی۔ ۱۶ اپریل۔ بابو انور علی صاحب سوداگر چرم جناب صدرالدین محمد حسین صاحبان و میاں جی عبداللطیف صاحب سوداگر چرم نے زر سالانہ مرحمت فرما کر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا۔

۱۷ اپریل۔ حافظ محمد صدیق صاحب رئیس و ڈپٹی میونسپل کمشنر نے ایک سال کے لئے خریداری منظور فرمائی۔ ۱۸ اپریل۔ میں کانپور سے رخصت ہو کر اٹاوہ پہونچا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اسلامیہ ہائی اسکول نے ایک سال کی خریداری فرما کر ممنون فرمایا۔ ہمارے قدیم معاون

سید بدر الحسن صاحب کے ذریعہ سے محمد یحییٰ شریف الحسن صاحبان سوداگران چرم نے خریداری منظور فرماکر زر سالانہ سے اعانت فرمائی - ۱۹ر اپریل - مولوی عبد الحفیظ صاحب ڈپٹی کلکٹر نے ششماہی خریداری منظور فرمائی - ۲۰ر اپریل - عابد حسن خاں صاحب رئیس میونسپل کمشنر نے ایک سال کی خریداری منظور فرمائی - اور جناب شفقت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر گورکھپور اور بشیر حسین صاحب انکم ٹیکس افیسر نے اجراء نگار کی اجازت دی جو صاحب موصوف نگار کے قدیم معاون ہیں - اسی سلسلہ میں مجھے مسٹر نفیس الحسن وکیل منشی احتشام علی صاحب، جناب احمد علی خاں صاحب، حبیب حسن خانصاحب مسٹر فاروق احسن خاں صاحب، اصغر حسین صاحب، بابو جوالا پرشاد صاحب ڈپٹی کلکٹر اور انکے علاوہ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جنھوں نے کانپور، فرخ آباد، اٹاوہ مین پوری، اور قنوج وغیرہ میں اعانت فرمائی

"تبسم"

ادبی جواہر

تذکرہ حسینی (فارسی) یہ ایک تذکرہ ہے جسمیں ہندوستان و اہل ایران کے فارسی گو شعراء کا ذکر ہے مگر مصنف نے اس خوبی اور عمدہ ترتیب کے ساتھ لکھا ہے کہ دیکھکر بیساختہ منہ سے کلمات آفرین نکل جاتے ہیں درمیان درمیان جو حکایات درج ہیں انھوں نے دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے - قیمت ۱۱ر

سراپائے سخن (اردو) یہ بھی ایک تذکرہ ہے جسمیں معشوق کے تمام اعضاء کی تعریف میں اساتذہ معروف و مشہور کے اشعار دئے گئے ہیں - عہ

زندگانی بےنظیر (اردو) یعنی سوانح عمری میاں نظیر اکبرآبادی - ہندوستان کے مشہور و مقبول ہر دلعزیز شاعر نظیر کی سوانح عمری نہایت اعلیٰ عبارت میں درج کی گئی ہے از پروفیسر شہباز قیمت عہ

سخن شعراء (اردو) ایک جامع اور دلچسپ تذکرہ شعرا - مصنف مولوی عبد الغفور نساخ قیمت عہ

کلیات انوری (فارسی) محمود غزنوی کے دربار کے سب سے بڑے شاعر انوری کا کلام مع ہزلیات قیمت ۸ر

دیوان شمس تبریز (فارسی) صوفیانہ بادۂ تصوف میں ڈوبا ہوا کلام ہے نہایت عمدہ کاغذ پر صحت و اہتمام کیساتھ حال ہی میں طبع ہوا ہے عہ

دیوان نعمت خان عالی (فارسی) نعمتخاں عالی وہ شاعر ہے جس کے کمال نے اُسے عالمگیر ایسے بادشاہ کے دربار میں ہر دلعزیز بنایا عہ

دیوان ملا نورالدین ظہوری (فارسی) ظہوری وہ شاعر ہے جسے غالب نے بھی مانا اور اس کا اتباع کیا ہے اسکا تمام و کمال کلام یہ ہے قیمت عہ

کلیات مرزا جلال اسیر (فارسی) جلال اسیر ان مشہور و مقبول شعرا میں سے ہے جو صاحب طرز گزرے ہیں - قیمت عہ

کلیات ظفر ہر چہار جلد (اردو) آخری تاجدار دہلی کا تمام و کمال کلام فصاحت زبان - روزمرہ - اور محاورہ میں ڈوبا ہوا ہے ۱۲ر

کلیات مومن - حضرت مومن کا پایہ شعرا میں امتیاز بردست ہے کہ دلی کے بڑے بڑے شعرا بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے قیمت عہ

دیوان ناسخ - اس کو نہایت صحت کے ساتھ چھوٹی تقطیع پر چھاپا گیا ہے جس سے شان کلام بڑھ گئی ہے قیمت عہ

کلیات میر - ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر میر کے پورے کلام کا مجموعہ ہے قیمت عہ **کلیات سودا** - میر کے حریف ظریف سودا کا وہ کلام جسنے انکے معاصرین پر انکی دھاک بٹھا دی تھی - ہر صنف شعر میں استاد کامل تھے قیمت عہ

المشتہر :- **منیجر نولکشور بکڈپو لکھنؤ**

کامنی عمر
سوانح عمرہ عیار عمر

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذی ۸ر
حاجی بغلول ۸ر
پیاری دنیا ۸ر
کایا پلٹ ۸ر
میٹھی چھری ۸ر
طرحدار لونڈی عہ
طلسمی فانوس عہ ۱۲ر

جوالا پرشاد برق

مرنالنی ۱۲ر
مار آستین ۱۲ر
بنگالی دلہن ۱۲ر
معشوقہ فرنگ ۱۲ر
پرتاب ۱۲ر
روہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی عہ
سکینہ بنت حسین ۶ر
ملکہ زنوبیہ ۳ر
قرۃ العین ۳ر
مخدرات عمر
جویائے حق للعہ
لعبت چین عہ
فاتح مفتوح عمر
بابک خرمی عمر

الفانسو ۱۲ر
ایام عرب عار
قیس و لبنیٰ عمر
یوسف و نجمہ عمر
زوال بغداد عمر
مینا بازار عہ
مقدس نازنین عمر
رومتہ الکبریٰ عمر
فلپانا عمر
شوقین ملکہ عہ
منصور موہنا ۸ر
حسن انجلینا ۸ر
ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
فردوس بریں ۸ر
حسن کا ڈاکو عمر
دربار حرام پور ۱۰ر
غیب دان دلہن عہ
بدر النساء کی مصیبت ۳ر
خوفناک محبت عمر
میوۂ تلخ
نیکی کا پھل عہ

حکیم محمد علی مرحوم ہردوئی

نیل کا سانپ عہ
رام پیاری صہ
عبرت ۳ر
حسن سرور للعہ
اختر حسینہ عار
دیول دیوی عمر
جعفر عباسہ ۱۲ر

شوق قدوائی مرحوم

ترانہ شوق عمر
قاسم و زہرہ عہ
نیرنگ جمال ۳ر

خواجہ عبدالرؤف عشرت

زندانی ۶ر
اصلاح زبان ۶ر
قواعد میر ۶ر
اول اردو ۶ر
جان اردو ۶ر
شاعری کی پہلی کتاب ۸ر
〃 دوسری کتاب ۸ر
〃 تیسری ۸ر
〃 چوتھی ۸ر

میر ولی اللہ بی۔ اے

بندگی عار
کاس الکرام ۳ر
لسان الغیب جلد اول ۳ر
〃 دوم عار
〃 سوم عار
〃 چہارم عار
تمکران نصاحت عمر
بادۂ ناب عہ

ظفر عمر بی۔ اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری عمر

بہرام کی گرفتاری عمر

مولوی عبدالماجد بی۔ اے

فلسفہ جذبات عار
مکالمات برکلے عمر
پیام امن ۳ر
تصوف اسلام عہ
زود پشیمان ۸ر
فلسفیانہ مضامین عمر

مولوی سید سلیمان ندوی

ارض القرآن للعہ
سیرۃ عائشہ عمر
حیات امام مالک عہ
خلافت عثمانیہ عہ
خلافت اور ہندوستان ۸ر

مولوی عبدالسلام ندوی

اسوۂ صحابہ دو جلد ۳ر
سیرۃ عمر بن العزیز عمر
انقلاب الامم عار
تاریخ الحرمین عار
فقرائے اسلام عمر
فطرت نسوانی عمر
شعر الہند دو جلد ۳ر

مولوی سعید انصاری

سیر الصحابہ جلد اول عمر
〃 دوم ۳ر
سیر الصحابیات عار

مولوی عبدالباری ندوی

مبادی علم انسانی عمر
برکلے کا فلسفہ عمر

مولوی عبدالرزاق ندوی

اسوۂ حسنہ عار
کتاب الوسیلہ عار
ترکی و یورپ ۶ر

مولوی نیاز فتحپوری

گیتان جلی عار
گہوارۂ تمدن عار
نگارستان عار
صحابیات عار
تاریخ الدولتین عمر

سید سجاد حیدر بی۔ اے

زہرا ۱۳ر
جلال الدین خوارزم شاہ عمر
خیالستان عمر
ثالث بخیر ۸ر
حکایات و احساسات عمر

مولوی راشد الخیری

صبح زندگی عمر
شام زندگی عمر
شب زندگی عار
نوحۂ زندگی ۱۲ر
منازل السائرہ عار

بنت الوقت ۸ر
قطرات اشک عمر
عروس کربلا عمر
یاسمین خام عمر
تیغ کمال عہ
ماہ عجم عمر
محبوب خداوند عمر
موؤدہ ۸ر

مولانا حالی مرحوم

مقدمہ شعر و شاعری عمر
دیوان حالی عمر

تاریخی دلچسپ پیسہ ناول

سراب فلسطین عمر
بالشویک شہزادی ۸ر
شہید وفا ۸ر
ممتاز بیگم ۸ر
شعلۂ رنگین ۸ر
محاصرۂ پیرس عہ
شیخ چلی عہ
بہادر ترک ۸ر
بہرام کی واپسی ۳ر
انقلاب فرانس عمر
حسن بنارس ۸ر
فطرتی جاسوس ۸ر
ترکی حرم سرا ۸ر
جنگ طرابلس ۸ر
بہرام چور عمر
زر پرست عمر

- کنجی کا راز
- عبد الرحمن ناصر
- عروس مصر
- سیلاب خون
- کرشمہ
- وفادار دلہن
- طواف زمین
- سیاحت زمین
- سیاحت ہوا
- نازنین مراکش
- سمندر کی سیر
- اسرار بالشویزم
- روح لیلی
- امین بک
- حجاج بن یوسف
- یوسف پاشا
- انقلاب عثمانی
- نیلی چھتری
- بہرام کی آزادی
- بہرام کی گرفتاری
- بہرام کی سرگزشت
- پر اسرار قتل

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب
- بزم خیال
- نشاط سخن
- انشار نسوان
- مکاتیب محسن الملک
- لیلی مجنون ڈراما

- مثنوی قاسم و زہرہ
- فسانۂ جوش

تاریخی کتابیں

- تاریخ اندلس
- تاریخ عرب
- اسرار رنگون
- شباب لکھنؤ
- مرقع اودھ
- ارض بہزین
- تفریح الاذکیا
- تاریخ حبیب اللہ
- مراۃ الکونین
- البدر
- قصص الانبیا
- صمصام الاسلام
- فتوح الشام
- تذکرۃ الکرام
- منہاج النبوۃ
- حیات العلماء
- مذاہب الاسلام
- روضۃ الصفا
- تاریخ اودھ
- خواتین رنگون
- سیر المتاخرین
- اعمال نامہ روس
- تاریخ مصر

- سلاطین اودھ
- صحیفۂ زرین
- تاریخ دربار
- تاریخ ایران

تصوف و اخلاق

- سیر الطیبات
- علم الاخلاق
- خدا کی ہستی
- نابینا علماء
- مختارات صوفیہ
- حیات ابدی
- افراد کا سبب
- عوارف المعارف
- بوستان معرفت ۵ جلد
- شجرۂ معرفت

مراثی

- مراثی دبیر
- مراثی انیس
- مراثی ضمیر
- مراثی مونس
- مراثی دیگر

تذکرۃ الشعرا

- تذکرۂ حسینی
- گلشن بیخار

- سراپائے سخن
- سوانح نظیر اکبرآبادی

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز
- کلیات عراقی
- دیوان حافظ
- دیوان نعمت خان عالی
- کلیات انوری
- دیوان بیدل
- کلیات سعدی
- دیوان عرفی
- کلیات جامی
- کلیات غالب
- کلیات صائب
- کلیات حزین
- دیوان عنصری
- دیوان ظہیر فاریابی
- دیوان غنی کشمیری
- دیوان ناصر علی
- دیوان ہلالی
- کلیات جلال اسیر

دواوین اردو

- دیوان حسن دہلوی
- کلیات ظفر
- کلیات مومن

- دیوان ناسخ
- کلیات میر
- کلیات سودا
- کلیات انشا
- کلیات نظیر اکبرآبادی
- گلزار داغ
- دیوان رند
- دیوان ذوق
- کلیات اسمٰعیل
- مراۃ الغیب
- صنمخانۂ عشق
- فریاد داغ
- دیوان فاضل
- دیوان شہیدی

فن شعر و عروض

- زر کامل العیار
- ترجمہ حقائق البلاغت
- عروض سیفی
- شجرۃ العروض

عجائب و غرائب

- عجائب المخلوقات مع تصاویر رنگین
- " با تصویر سادہ
- مجمع الفنون
- طلسم فرنگ
- کارخانۂ عالم

زنانہ لٹریچر کے ناولوں کے ترجمے

- الدین و لیلی
- فریب حسن
- سوزن عشق
- روز الیمبرٹ
- ناول اسرار
- شام جوانی
- طلسمی فانوس

زنانہ کتب خانہ

- شوکت آرا بیگم
- درس حمایت
- خاتون جنت
- بیوی کی تربیت
- بہشتی زیور ۱۰ حصے
- بہشتی گوہر
- اقبال دلہن
- حسن معاشرت
- جواہر ریزے
- عورتوں کی انشار
- بیوی کی تعلیم
- تربیت اطفال
- اصلاح معیشت
- شمع ہدایت
- اصلاح الرسوم
- جہان آرا بیگم
- بچوں کی پرورش
- آرسی مصحف
- سدا سہاگ
- ترغیب روزگار

نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ